بادل چھٹ گئے



یوگیش داس



بادل چھٹ گئے

ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

بادل چھٹ گئے

یوگیش داس

مترجم

رضوان احمد



نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

1979 (ساکا 1901)

قیمت: 10/50

ORIGINAL TITLE: DAOR ARUNAI (Assamese)

URDU TRANSLATION : BADAL CHHAT GAYE.

ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ A/5 گرین پارک، نئی دہلی 110016 نے
جے۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرز جامع مسجد، دہلی 110006 میں چھپوا کر شائع کیا۔

دیباچہ

ہندوستانی اور دوسرے علاقائی ادب کی طرح آسامی ناول نے بھی مغربی ادب کی دھوپ چھاؤں میں ارتقا کی منازل طے کی ہیں۔ آسامی ادب کا پہلا ناول نگار کون ہے، یہ بتانا مشکل ہے۔ تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اولین کہانیوں کی تخلیق امریکی مشنریوں نے کی تھی جن کا خاص مقصد آسام میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنا تھا۔ عیسائی مذہب کی بنیادی باتوں کی تبلیغ کے لئے ان لوگوں نے جان بن ین کی 'پلگرمس پروگریس' (1678) کہانی 'یاتری کریاترا' کے عنوان سے شایع کی تھی۔ اس کے کچھ حصّے قسط وار سن 1851ء سے 'ارونودے' نامی رسالے میں شایع ہوئے تھے۔ اس کے بعد 'کنی بیہپیرو ار سادھو' (انڈے بیوپاری کی کہانی) جیسی کہانیاں آسامی میں آئیں۔

جان بن ین خود مذہبی مبلغ تھے اسی لئے ان کے ادب نے 'ارونودے' کے ذریعے تمام مذہبی تبلیغ کرنے والی مشنریوں کی توجہ ان پر مرکوز کر دی تھی۔ 'پلگرمس پروگریس' کو آسامی کا پہلا ناول کہنا غلط ہوگا۔ دراصل یہ انسانی زندگی کی خامیوں، خوبیوں، خواہشات، امنگوں، جدوجہد، کمزوریوں، خود اعتمادی وغیرہ کے تانے بانے سے ارتقا پذیر ہونے والی ایک تمثیل ہے جس میں عیسائی مذہب کی روح جاری وساری ہے۔ دوسری جانب اے۔ سی۔ وارڈ نے "پلگرمس پروگریس" کا موازنہ مذہب کے سلسلے میں غیر جانب دار ناولوں کے ساتھ کرتے ہوئے اسے ایسے عیسائی ناولوں کی واحد مثال قرار دیا ہے، جو ان ناولوں سے کسی بھی معنی میں کمتر نہیں ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ کردار نگاری اور حالات کا تجزیہ بامقصد ہونے کی وجہ سے 'یاتری کریاترا' نے

آسام کے ابتدائی داستانی ادب کو کسی حد تک متاثر کیا تھا۔ 'یاتری کریا ترا' کا دائرہ یوں تو محدود ہے لیکن تاثر، کہانی پن اور فکر کے لحاظ سے اس کی اپنی تاریخی اہمیت ہے۔

آسامی ناول پلاٹ اور کردار نگاری کے علاوہ بھی کئی پہلوؤں سے اثر انداز ہوا ہے۔ فن کار کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں کسی حد تک حقیقت کی رنگ آمیزی کر پاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یوگیش داس کا ' داورارونائی' (بادل چھٹ گئے) ایک اہم تخلیق ہے۔

اگر تبلیغ فکر کو ضرب نہ پہنچائے تو محض اس بات پر کسی ناول کو خام نہیں کہا جاسکتا کیونکہ کسی ناول کی کامیابی ان اجزاء پر منحصر ہے —— (1) ناول نگار کی تخلیقی صلاحیت، (2) قصہ میں دلچسپی پیدا کرنے کی صلاحیت، (3) جاندار کردار نگاری کی صلاحیت اور' (4) پلاٹ میں گہرائی پیدا کرنے کی صلاحیت۔ کرداروں کا تجزیہ کرنے اور کہانی کی دلچسپی برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ سماجی اور داخلی کشمکش کا اظہار کرنے والا ہماری زبان کا پہلا ناول 'کامنی کانت' ہے۔ پدماوتی بھوکنتی کا ' سدھرمار اُپاکھیان' ایک داستانی تخلیق ہے۔ اس میں کردار نگاری کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ناول کی تکنیک سے ناواقفیت کی وجہ سے ہی بھوکنتی کی اس تخلیق میں جھول ہے۔ دنڈی ناتھ کلتا کی 'سادھنا' کے علاوہ 'محمد پیار'، دین شرما وغیرہ کے ناولوں نے بھی حقیقت پسندی کا رخ اختیار کیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ سب ایک ہی رو میں بہہ رہے ہیں۔ یہ ناول، حقیقت پسندانہ ناول کی کڑی نہیں کہے جاسکتے۔ یوگیش داس کے ناول، داورارونائی' کو صحیح معنوں میں سماجی احساس کی تخلیق کہا جاسکتا ہے۔

آسامی ادب کی قدآور شخصیتوں رجنی کانت بردلے اور پدم ناتھ گوہائیں بردا کے ہاتھوں ہی اولیں ناول وجود میں آئے۔ ان کے ناول تاریخی اور رومانی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ تاریخ کے محدود کینواس پر تخیلات کی رنگ آمیزی کی گئی تھی۔ اسی پس منظر میں گزشتہ صدی کی نویں دہائی میں عام زندگی کے حقیقی واقعات اور ماحول کی عکاسی کرنے والے ناولوں کی تخلیق ہوئی جن میں روزمرہ کے مسائل کی کارفرمائی تھی۔

کلاسک سے تعلق جوڑتے ہوئے حقیقت نگاری پر ہی ناول کے بامعنی ہونے کا انحصار ہے۔ تاریخی واقعات کے علاوہ تخلیقی صلاحیت بھی ادیب میں ہونی چاہیے۔ عام زندگی کے احساسات سے قریب تر رہنے کے باعث ہی تاریخی ناول نگار کی شکل

میں گوہائیں بروا اور بردلے کی تخلیقات کو کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ گوہائیں بروا کا ناول 'بھانومتی' 1890ء میں شایع ہوا۔ بھانومتی ناول کا موضوع آہوت سلطنت کے خلاف ہوئی بغاوت ہے اور 'لاہری' ناول کا موضوع آسام پر برمیوں کا حملہ ہے۔ نوجوانوں کی جدوجہد دونوں ہی ناولوں کا مرکزی موضوع ہے۔ دونوں ہی ناولوں میں کردار نگاری بے حد اچھوتی، منفرد اور جاندار ہے۔ یہ انفرادیت متوازی واقعات کو گرفت میں یکساں میں توازن پیدا کرتی ہے۔

دوسرے ناول نگار رجنی کانت بردلے کے ہاتھوں تاریخ نے صاف ستھری شکل اختیار کی۔ برمی حملے کے بعد جب انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا تو اس غیر یقینی صورت حال میں انسانی ذہن نے قدرتی طور پر ماضی میں پناہ لی۔ اس زمانے میں ادیب اور قاری دونوں میں تاریخی واقعات کی مقبولیت اسی وجہ سے ہوئی۔ آسام میں بہت سی تاریخی چیزیں ہیں۔ انہیں کو موضوع بنا کر تاریخی ناولوں کی تخلیق کی گئی۔ اس ذیل میں رجنی بردلے کے ناول 'منومتی' کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اگرچہ حقیقت نگاری کی جانب ہی زیادہ توجہ دی تھی لیکن اس کے باوجود ان کا 'مری جیئری' (میری لڑکی) ناول رومانٹک احساسات کی جانب مائل ہونے پر مجبور ہوا تھا۔

ناول نگار کی حیثیت سے رجنی بردلے سر والٹر اسکاٹ اور بنگال کے بنکم چندر چٹوپادھیائے سے متاثر ہوئے تھے۔ اس بات کو ناول نگار بردلے نے 'ڈندوا دروہ' (1909) کے دیباچہ میں خود ہی تسلیم کیا تھا۔ آدی باسی سماج کے موضوع پر لکھا گیا 'میری لڑکی' (1885) کے علاوہ بردلے کے دوسرے ناول تاریخی ورومانی واقعات کے محور پر رقص کرتے ہیں۔ 'مری جیئری' دو نوجوان دلوں 'جنکی' اور 'پانئی' کا المیہ ہے اور ناول نگاری کی پہلی تخلیق ہونے کے باوجود اس میں بردلے کی خصوصیات کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اس ناول کی تکنیک تمثیلی ہے۔ بدلتے ہوئے قدرتی حسن سے بردلے کو خاص دلچسپی ہے جس کا اظہار 'مری جیئری' میں ہوا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ 'قدرت کے معاملات میں مصنوعی تبدیلی' سے متاثر ہوئے ہیں، مناسب نہ ہوگا۔

برمی حملے کے پس منظر میں لکھا گیا 'منومتی' (1900) تاریخی ناولوں میں سب سے اہم ہے۔ برمی فوج کے ہاتھوں 'ہادراچکی' نامی جگہ پر آسامی فوج کی شکست کے

پس منظر میں دو نوجوان دلوں کی پر الم داستان ہی اس کا مرکزی خیال ہے۔ 'رومیو جولیٹ' کی طرح ان محبت کرنے والوں کے خاندان میں زمین کے تنازعہ کو لے کر جو کشمکش ہوتی ہے وہ اس ناول میں جان ڈالتی ہے۔ برنگر کے زمین دار چنڈی بردا کے خاندان کی لڑکی ہے ـــــ منومتی۔ اسی طرح عاشق نوجوان لکشمی کانت، ہل کانت بردا کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ناول میں منومتی کی سہیلی اور بھگت شانتی رام نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ سماجی مسئلوں پر اس ناول کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ زبان کی سلاست نے اس ناول کو بے حد دل کش بنا دیا ہے۔ ناول نگار بردلے کرداروں کی خامی، خوبی، مضبوطی اور کمزوری سب کے تئیں مخلص ہیں۔

بردلے کا ایک اور ناول ہے 'رنگیلی' (1925) ضمنی طور پر اگر اس میں فلسفہ نہ ہوتا تو اسے مکمل المیہ ناول کہا جا سکتا تھا۔ آہوم سلطنت کے آخری دور میں سماجی قدروں کا زوال ہی اس ناول کا پس منظر ہے۔ 'رنگیلی' کی طرح بردلے کے ناول 'رہدے لگری' کی ہیروئن کو حکومت کی چاہ ہے اس لئے سازشوں کا شکار ہو کر اسے پریشان ہونا پڑتا ہے۔ حکومت کی جانب سے معتوب دیارام نامی ایک نوجوان کے تئیں ہیروئن کی ہمدردی ہی اس میں جان ڈالتی ہے۔

'نرمل بھکت' (1926) مواد کے لحاظ سے ارونودے یگ کے ناولوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ لیکن تکنیک اور زبان کے لحاظ سے زیادہ ارتقا پذیر ہے۔ بردلے کے اس ناول سے مذہبی احساس کا اظہار ہوتا ہے۔ مواد تیز رفتار زندگی سے متعلق ہونے کے باوجود مذہبی احساسات کو وہ نظر انداز نہیں کر سکے ہیں۔

ناول نگار بردلے کے دوسرے ناول ہیں" تامریشوری مندر" (1936)، "ڈندوا دروہ" (1909) 'رادھا رکمنی' (1925) اور 'کھانبا ار دکھوئیبی'۔ وطن کی محبت کا جذبہ ان کے یہاں ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ وطن سے محبت کی جڑیں رومانس میں پیوست ہیں۔ رومانی جذبات سے زیادہ متاثر ہونے کے باوجود تاریخی پہلوؤں سے ان کی خاص دلچسپی ہے۔ کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے کہیں کہیں بردلے جی بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں عصری آگہی ہے جن سے نظریات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

پدم ناتھ 'گوہائیں بردا اور رجنی کانت بردلے کی تخلیقات ناولوں کا وہ دور ہے جب ماضی کی سماجی قدروں کا ہمارے اندر بہت شدت سے احساس تھا۔

اسی وجہ سے کہانی کا مواد تاریخی واقعات سے لیا گیا۔ ساتھ ہی طنزیہ تخلیق بھی وجود میں آسکی۔ گوہائیں بروا اور بردلے کے ناولوں میں ڈرامائی عناصر کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کے ادب میں جنگِ آزادی کی ہی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ غیر ملکی حکومت کے تسلط نے سماجی زندگی کو جس طرح زنگ آلود کر دیا تھا اس میں نئی سماجی قدروں کی روح پھونکی گئی اور یہ ادب کا موضوع بن سکیں۔ دنڈی ناتھ کلیتا کا ناول 'سادھنا' (1938) گوہائیں بروا اور بردلے کی تخلیق کردہ تاریخی روایات سے الگ ہے۔ یہ ناول سماجی ناولوں کے رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ سماج میں جہاں غلط رسوم کا سہارا لے کر مظالم کرنے والے لوگ ہیں وہیں سماجی آدرش کے تئیں قربانی دینے والے بھی کچھ لوگ ہیں۔ یہی دو طرح کے کردار 'سادھنا' میں آتے ہیں۔ حقیقت پسندانہ ناولوں کے اولین خالق دنڈی ناتھ کلیتا کے دوسرے ناول 'اوشکار' (1950) 'پریچے' (1950) اور 'اگن و پلو' (1950) ہیں۔ کلیتا کا انداز بیانیہ ہے ان کے یہاں کذب و صداقت کا راستہ واضح ہے اور اس کے درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

گاندھی جی کے آدرش نے کلیتا کے ذہن کو متاثر کیا تھا۔ ان کے بعد کے تخلیق کاروں نے بھی مہاتما گاندھی کے اصولوں سے مواد لے کر ناول لکھے تھے۔ یہاں دیو تعلقدار کے نام کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔ دیو تعلقدار کے ناول 'ڈھولی گنولی' (1922) 'اپورن' 'اگنئے گری' (1924) 'ودروہی' (1939) اور 'آدرش پیٹھ' وقت کا ساتھ دینے والی تخلیقات ہیں۔ اگرچہ یہ ساری تخلیقات اقدار کے لحاظ سے بامقصد ہیں۔ اپنے ناولوں کے ذریعے تعلقدار سماجی قدروں کا تعین کرتے ہیں۔ ان کے اندر سماجی احساس بہت شدید ہے اسی لئے وہ نئے سماج کی تعمیر کا پس منظر تیار کرتے ہیں۔

کلیتا اور تعلقدار کی تخلیقات کے باوجود رجنی بردولے کے بعد اس صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی تک آسامی ناول کوئی خاص وقیع مقام حاصل نہیں کر سکا تھا۔ شرت گوسوامی کا 'پانی پتھ' (1930)، شانتی رام داس کا 'بیراگی' (1921) اور سنیہ بھٹاچاریہ کا 'وینا' (1916) یہ چند ناول تخلیق اور تکنیکی اعتبار سے نامکمل ہونے کے باعث زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ دنڈی کلیتا کے 'سادھنا' اور دین شرما کے 'اوشا' کے علاوہ اس دور میں کسی قابلِ ذکر ناول کی تخلیق نہیں ہوئی۔ 'اوشا' بنیادی طور پر ایک رومانی ناول ہے۔ اس کے بعد آسامی ناول کے ارتقا کا دور آیا۔ آسامی ناول کے محدود پس منظر

میں وینا بروا کا 'جیونر باٹن' (1945) ایک 'نئی ہوا کا جھونکا ہے' ہے۔ عام انسانوں کی زندگی کو کامیابی سے پیش کرنے اور دیہی زندگی کی عکاسی کرنے کے باعث یہ ناول بے حد مقبول ہوا۔ انسانی ہمدردی سے عبارت ہونے کی وجہ سے یہ بے حد دل پذیر ہے۔ تکنیک اور کردار نگاری کے لحاظ سے بھی مکمل ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے دوران ہمارا ناول ارتقاء پذیر ہوا۔ اس زمانے میں جنگِ عظیم کی وجہ سے جو غیر یقینی صورت حال پیدا ہوئی اس نے ہمارے ناول نگاروں کی توجہ دیہی زندگی سے ہٹا دی 'جیونر باٹن' میں دیہی زندگی کی قدروں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ادبی لحاظ سے یہ زمانہ جمود کا ہے۔ غیر یقینی صورتِ حال اور غیر محفوظیت کے احساس نے تخلیقی صلاحیت کند کر دی تھی۔ ہیروشیما کے بعد اور جنگ کا خوف دور ہو جانے پر پھر زندگی نے نئی انگڑائی لی۔ جنگ نے جس طرح سماجی احساس کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا تھا، 1942 کی عوامی تحریک کے ذریعے پھر سے عوام میں سماجی شعور پیدا کرنے کا کام خاص طور پر کمل نرائن دیو کی ادارت میں شایع ہونے والے رسالے 'جینتی' نے انجام دیا۔ دھیرے دھیرے اس کا دائرہ وسیع ہوا اور اس کے ساتھ ہی عصری آگہی رکھنے والے ادب کی تخلیق ہونے لگی۔

جنگ کے بعد کے کچھ ابتدائی سال محمد پیار کے رہے۔ غریبی اور سماجی ناانصافی ہی محمد پیار کے خاص موضوعات ہیں۔ 'پریت اپہار' (1947) 'سنگرام' (1948) 'مرہا پاپری' 'جیون تینر چانچی' (1948) 'ہیرو اسورگ' (1952) اور 'ہائفن' (1959) وغیرہ ان کے ناول ہیں۔ اسی زمانے میں سماجی اور معاشی مسائل پر مبنی دوسرے ناول بھی لکھے گئے جن میں دین شرما کا 'سنگرام' ضمیر الدین کا 'سماج' 'سندھان'، 'سنگرام' متھرا ڈیکا کا 'ہمونیاہ'، سومار کا 'کیر بینیہ کپال' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان ناولوں میں سماجی و اقتصادی مسائل کی حقیقی انداز میں عکاسی کی گئی ہے اور نفسیاتی تجزیے سے کام نہیں لیا گیا۔

1954 میں دو ایسے ناول شایع ہوئے جن میں سماجی احساس کی کار فرمائی ہے۔ ایک ہے رادھیکا موہن گوسوامی کا 'چاک نیا' اور دوسرا ہے لوکا نت بروا کا 'کیلی پریا سادھو' اس کے بعد اگلے سال یوگیش داس کا 'داور ارونائی' (1955) شایع ہوا۔ گزشتہ جنگِ عظیم نے اس ریاست میں جو حالات پیدا کیے اور اس سے جو سماجی و

ذہنی اتھل پتھل پیدا ہوئی، داور ارونائی' (بادل چھٹ گئے) ان کا حقیقی عکاس ہے۔
سی۔ای۔ مانٹیگیو کے دو ناولوں 'دس این سینٹ میٹ' (1922) اور زاف جینٹس' (1925) کی طرح 'داور ارونائی' میں بھی جنگ سے پیدا شدہ دردناک حالات کا بیان ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار باکھر محض غور و فکر کرنے والا ایک نوجوان ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر سماج کی خدمت کرنے کا جذبہ جیون نام کے ایک انقلابی نے بیدار کیا تھا۔ ناول نگار نے اسے 1942 کی عوامی تحریک کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ ناول میں دو طرح کے کردار ہیں۔ ایک گریلا، گوری اور بدرالدین جن کی آتماؤں کو جنگ کی نجاستیں آلودہ کر جاتی ہیں۔ ناول نگار نے انہیں تلخ حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے۔ باکھر، بھیم، نظام اور جیون دوسری طرح کے کردار ہیں۔ انہیں جنگ کی چمک دمک آلودہ نہیں کر پاتی ہے۔ ان کے کرداروں کو یوگیش داس نے خامیوں سے پاک بنا کر پیش کیا ہے۔

قدروں کی شکست وریخت کے پس منظر میں 'ڈاور ارونائی' انسانی جذبے سے سرشار ہے۔ اس کے ذریعے جہاں ناول نگار کی تخلیقی جدت کا اظہار ہوتا ہے وہیں زبان پر مضبوط گرفت کا بھی پتہ چلتا ہے جو پورے ناول میں نظر آتی ہے۔ انہوں نے جس طرح اپنی تخلیقی اپج کا ثبوت دیا ہے اور خامیوں سے پاک کرداروں کی تشکیل کی ہے وہ اپنی جگہ بے مثال ہے۔ کنواری اور شادی شدہ عورت کے جذبات کے اظہار پر انہیں قدرت حاصل ہے۔

ایسی بات نہیں ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم نے صرف ڈمڈما شہر کو ہی چھوا تھا بلکہ یہ تبدیلی پورے آسام نے محسوس کی تھی۔ بالائی آسام کے چائے بگان عموماً خالی ہو گئے تھے۔ اس میں کام کرنے والے مزدور زیادہ پیسے کمانے کے لالچ میں فیلڈ بنانے کا کام کرنا پسند کرتے تھے۔ سینکڑوں چائے بگانوں کے مزدور اس کام میں لگ گئے۔ خیر جان چائے بگان کے بڑے کرانی کی طرح بابو لوگ بھی اس کام میں تعاون کر کے دو پیسے کماتے تھے۔ اسی وجہ سے اس ناول میں خیر جان چائے بگان کے بڑے کرانی کے مکان پر ہم کام تلاش کرنے والے مزدوروں کو دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے کرانی کو پانچ روپے نذر کرنا بھی نہیں بھولتے۔

ڈاور ارونائی' جنگ جیسے وسیع موضوع پر لکھا گیا لیکن اس کی حدود متعین ہیں۔

جنگ کے بارے میں جاننا ہو تو چوکیرٹی میں بنایا ہوا ملٹری میدان دیکھنا ہی کافی ہے۔ اسی طرح چائے بگانوں کے متعلق بھی اس میں بڑے اچھے انداز میں لکھا گیا ہے۔ کردار مکمل اور واضح ہیں۔ جنگ کی تیز رو میں بہنے والے گریلا، گوری، نیل کانت وغیرہ کے کردار مکمل ہیں۔ اسی طرح آدرش وادی نوجوان کی شکل میں باکھر، بھیم، نظام کے کردار بھی بالکل مکمل ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ان دونوں طرح کے کرداروں کے درمیان نظریات کی وسیع خلیج ہونے کے باعث ٹکراؤ نہیں ہوا ہو، ایسی بات نہیں ہے۔ اس میں انوپما کا کردار لافانی تخلیق ہے۔ انوپما شکوک کا شکار ہے۔ رینوا اور جنگ میں بہتی ہوئی دولت سے مالدار بنے ہوئے دوسرے لوگوں کی امارت دیکھ کر اس کا ذہن الجھ جاتا ہے۔ اس کے اندر دولت و ثروت کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ انوپما کا کردار ایک پہیلی ہے۔ وہ شوہر سے بے پناہ محبت بھی کرتی ہے لیکن پھر نظریات کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اسی طرح گوری کا کردار بھی ایک معمہ ہے۔ بھیم کے تئیں اس کی محبت ظاہر ہے۔ آخر میں اس کی موت دردناک حالات میں ہوتی ہے۔ ملٹری کی گاڑیوں میں چڑھ کر گھومنا پھرنا اسے اچھا لگتا تھا اور یہی چیز اس کی بربادی کا باعث بنتی ہے۔ خیر جان چائے بگان کے بڑے بابو شاکیہ کے یہاں انقلابی جیون دادا کے پناہ گزین ہونے کے باعث پولیس باکھر کو پکڑ لے گئی تھی۔

یوگیش داس اختصار سے کام لیتے ہیں۔ ایسا وہ صرف اپنے افسانوں میں ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ ناول کے ساتھ بھی ان کا یہی رویہ ہے۔ یہی اختصار ان کی کہانی کو حسن بخشتا ہے۔ 'ڈاور ارونائی' میں نفسیاتی تجزیے سے کام نہیں لیا گیا۔ دراصل یہ ایک بیانیہ ناول ہے۔ بہت پہلے پڑھی ہوئی ایک بات مجھے یاد ہے کہ سماج میں متوسط طبقے کا اثر جس قدر بڑھے گا داستانی ادب اتنی ہی اہمیت اختیار کرتا جائے گا۔ یہ بات اگر درست ہو تو داستانی ادب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ متوسط طبقے کا اثر بڑھا ہے۔ یوگیش داس نے اگرچہ جنگ کے تئیں نفرت کا اظہار نہیں کیا ہے پھر بھی امن کے لئے ان کا خلوص بے مثال ہے۔ جنگ انسان کے کردار کو کس طرح مسخ کر ڈالتی ہے اس کی مثالیں ناول میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔

ہر غیر ملکی حملہ اندرونی تبدیلی لاتا ہے۔ برمی فوج کے حملے سے بھی آسام میں تبدیلی آگئی تھی۔ اسی تبدیلی نے سماجی بیداری پیدا کی تھی۔ یوگیش داس کے دل و دماغ کو بھی اسی بیداری نے متاثر کیا تھا۔ وہ اپنی تہذیب و ثقافت سے اٹوٹ لگاؤ رکھنے

کے باوجود حقیقت پسندانہ بنیادوں پر سماج کی تعمیرِ نو کے خواہش مند ہیں۔
یوگیش داس کے ناول حقیقت و تصور کا ملا جلا اظہار ہیں۔ لیکن ان کے رویے سے حقیقی اور بنیادی قدروں پر کہیں ضرب نہیں پڑتی ہے۔ ان کے ناول حالات کے ترجمان ہیں۔ اپنا بنیادی کردار مسخ کیے بغیر عورتیں ہمت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتی ہیں اور حقیقی جرأت، دلیری اور دوراندیشی سے مسائل کا حل نکالتی ہیں۔ ان کے کردار راج کمار یا راج کماری نہیں ہیں۔ یہ سب کے سب سماج کے حقیقی افراد ہیں۔ کردار کے تجزیے، پلاٹ سازی اور ترسیل کی کامیابی سے داس کی چابکدستی کا پتہ چلتا ہے — یوگیش داس اپنا ایک نظریہ اور آدرش رکھتے ہیں۔
جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا یوگیش داس کا ناول 'ڈاور ارونائی' ایک بامعنی تخلیق ہے۔ پہلے ایڈیشن میں مصنف نے خود کہا ہے۔۔۔

> "نوعمری کے نامکمل تجربات و مشاہدات کے باعث جنگ عظیم کے زمانے کے ہندوستان کے پس منظر میں ناول لکھنے کی ہمت کبھی میں نہیں کر پاتا۔"

مشاہدات ہمیشہ ناپختہ و نامکمل ہی رہتے ہیں۔ عمر زیادہ ہونے پر ہی کسی ناول نگار کے تجربات پختہ ہوں گے ایسی بات نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو فرانسیسی ادب میں ایک انیس سال کی لڑکی تہلکہ مچا دیتی۔ اس نقطۂ نظر سے شری داس کا خوف بے معنی ہے۔ یوگیش داس کے اور دوسرے ناول 'سہاں رپائی'، 'جوناکیر جوئی'، اور 'نروپائے نروپائے' وغیرہ ہیں۔
آسامی ناول نگاروں میں ایک اور اہم نام ڈاکٹر ڈی۔ پی گوسوامی کا ہے۔ ان کا ناول 'کینچا پاتر کپنی' (سبز پتے کی لرزش) اپنی طرزِ نگارش اور کردار نگاری کے اعتبار سے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کی چہل پہل اور مختلف رجحانات کے درمیان توازن قائم رکھتے ہوئے ڈاکٹر گوسوامی بڑی کامیابی سے گزر جاتے ہیں۔
1958 میں کیلاش شرما کا ناول 'ودروہی نگار ہاتت' شائع ہوا۔ ان کے ناول میں باغی ناگاؤں کے خفیہ کاموں کا ذکر ہے۔ ناگاؤں کی سماجی زندگی کے بارے میں شرما کا ایک اور ناول 'انامی ناگنی' ہے۔ ناگاؤں کی سماجی و مذہبی زندگی سے روشناس کرانے والا یہ سب سے قابلِ ذکر ناول ہے۔ ناگا زندگی کے بارے

میں دوسرا اہم ناول ویریندر کمار بھٹاچاریہ کا 'اِیاردِ اِنگم' ہے۔ ناگا زبان کے اس لفظ کا مطلب ہے عوامی حکومت۔ ناگا عوام کی سادہ زندگی، ایک طبقے پر عیسائی مذہب کا اثر، پرانی روایات کے سامنے چیلنج، سیاسی بیداری، جاپانی حملہ سے پیدا شدہ نیا احساس اور فیزو کے ذریعے خود مختار ناگا ریاست کی مانگ وغیرہ سبھی موضوعات ویریندر کمار بھٹاچاریہ کے اس ناول میں بہت دل چسپ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ وریندر بھٹاچاریہ کے دوسرے ناول ہیں ——— 'راجپتھے رِنگیائے'، 'شت گھنی'، اور 'آئی' ان میں سب سے پہلا سیاسی ناول ہے ——— 'آئی' (ماں) نامی ناول میں دیہی زندگی کی گہری چھاپ کے ساتھ ساتھ گاؤں کی معاشیات اور سادہ سماجی زندگی کو شہری زندگی کی چمک دمک نے جو چیلنج دیا ہے اس کا اظہار بے حد پرکشش ڈھنگ سے ہوا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شاعر یا افسانہ نگار ناول نگاری کے میدان میں کامیاب نہیں ہو پاتے لیکن آسامی زبان کے معروف ناول نگار عبدالمالک پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ انہوں نے 'سورج مکھیر سوپن' ناول کے ذریعے ساحلی علاقے کی دیہی زندگی کی کامیاب تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کا ایک اور ناول 'جیا جُبر رگھاٹ' انسانی زندگی کے درد مندانہ احساس کا عکس ہے۔ 'کنٹھہار' انیہ پرکاشں انیہ تارا، روپ تیر تھ یاتری' آدھار شلا' مالک کے دوسرے ناول ہیں ——— مالک کا رویہ آدرش کا پرستش کرنے والا نہیں ہے اسی لئے وہ حالات کو دیکھ کر مزاج کی تشکیل کرتے ہیں۔ سماج میں خلفشار پیدا کرنے والے مسائل پر ان کا ردِ عمل تیکھا ہوتا ہے۔ سماجی مسائل پر مالک افسوس نہیں کرتے بلکہ ان کے خلاف سخت ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں جب کہ یوگیش داس افسوس کرتے ہیں، مخالفت نہیں کرتے۔

'جیومر باٹن' ناول کے مصنف وینا بروا (دوسرا نام راشنا بروا) کے 'سیوجی پاتر کاہنی' (1958) ناول میں چائے بگان کے مزدور طبقے کی سماجی زندگی، معاشی حالت، جنسی گھٹن، چائے بگان کے یوروپی منیجر اور ان کی بیوی مسز ملر کی کہانی وغیرہ سارے موضوعات کا نفسیاتی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ 'سیوجی پاتر کاہنی' نفسیاتی، تجرباتی، بیانیہ ناولوں کے زمرے میں آتا ہے۔

زبان پر گہری دسترس رکھنے والے ناول نگار چند پرساد شاکیہ کا ناول 'منداکرانت' (1960) رومانی آدرش واد کی کہانی ہے۔ شاکیہ کی مسائل پر بہت گہری نظر ہے۔ 'منداکرانت' میں بڑی دبیز رنگ آمیزی ہے۔ ان کا دوسرا ناول 'میگھ ملار' ہے۔

تخلیقی اعتبار سے جنسی جذبات کے اظہار کے دو پیرائے ہیں:

الف : صاف طور پر جنس کا اظہار جو ادیب اور قاری دونوں کے اندر یکساں طریقے پر جنسی جذبات کو مشتعل کرتا ہے۔

ب : مس میکارتھی کے ذریعے مشہور طریق کار۔ اس کے ذریعے قاری اور مصنف کسی کے بھی جذبات برانگیختہ نہیں ہوتے۔ یوگیش داس اور راشنا بروا کے یہاں دوسری طرح کی فن کاری ہی نظر آتی ہے۔ آسامی ناول نگار پدم برکٹکی اور ہومین برگوہائیں کے یہاں پہلے ڈھنگ کا طریقہ برتا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں میں جنسی لوازمات کی کارفرمائی محسوس ہونے کے باوجود پدم برکٹکی کا فن جنسی اشتعال انگیزی کے بجائے طنزیہ ہی ہے۔ 'منر داپون' 'خبر وچاری' 'کولو کھید تائی' وغیرہ برکٹکی کے دوسرے ناول ہیں۔

آسامی ادب کے ایک اور ناول نگار ہومین برگوہائیں بنیادی طور پر حقیقت پسند فن کار ہیں۔ ان کا 'سبالا' (1963) شدید جنسی گھٹن کی کہانی ہے۔ برگوہائیں مختلف شکلوں سے وجودیت پسند ہیں۔ (1) فنکارانہ پیرایۂ اظہار کے میدان میں (2) نفسیاتی اعتبار سے کرداروں کی زندگی میں اتفاقات کی شدت کو کم کرکے تجربات کے اظہار کے میدان میں۔

لکشمی نندن بروا کا 'گنگا چل نیر پا کھی' (1963) کسانوں کی سادہ زندگی اور شہر کی چمک دمک کے درمیان مقابلہ کرتے ہوئے مصنوعی شان و شوکت پر چوٹ کرتا ہے۔ جوہن بایہ کی طرح لکشمی نندن بروا کا ردعمل مذہبی رجحانات کے اعتبار سے نہیں بلکہ داخلی جذبات کے تحت ہوتا ہے۔ ان کا ایک اور ناول ہے 'سیتی سُرے اُتلا'۔

آسامی ناول کی یہی مختصر تاریخ ہے۔ اس پس منظر میں یوگیش داس کا

'ڈاورارونائی' حقیقت پسندانہ ناول ہے ۔ اس کے متعلق کافی چرچا کی گئی ہے۔ گذشتہ جنگ کے پسِ منظر میں لکھا گیا یہ ناول کردار نگاری اور پلاٹ کے اعتبار سے بھی ایک منفرد تخلیق ہے۔

—— ہیم بردا

دنیا میں ضرور آگ لگ گئی ہے۔

نہیں تو ایک 'رباب' لیموں کی قیمت پانچ روپے ۔ بھلا اس بات پر کون یقین کرے گا؟ دفتر میں سنی ہوئی یہ بات خیرہ جان چائے بگان کے بڑے بابو شاکیہ نے اپنے گھر آکر بتائی ۔ باورچی بھیم چند سن کر حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے شاکیہ کے بیٹے باکھر کو یہ خبر سنائی ۔ باکھر نے صرف اتنا ہی کہا ــــ

" دنیا میں آگ لگ گئی ہے بھیم ۔ چاروں طرف جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ آدمی کی قیمت کم ہو گئی ہے، چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں ۔ اگر مجھے بیچا جائے تو شاید پانچ پیسے بھی نہیں ملیں گے ۔"

پانچ روپے والے 'رباب' لیموں کی طرح اور بھی بہت سی کہانیاں پھیلی ہیں ۔ سنتے ہیں کہ ایک بڑھیا اتوار کے بازار میں بڑے لیموں اور 'رباب لیموں بیچ رہی تھی ۔ ایک موٹے امریکی سپاہی نے ایک بڑا سا 'رباب لیموں اٹھایا اور پوچھا" ہاؤ مچ ؟" یعنی کتنا؟ بوڑھی نے بے بسی سے دونوں ہاتھوں کی دسوں انگلیاں دکھا کر کہا ــــ

" دو صاحب دس پیسے ۔"

سپاہی نے کہا ــــ

" نہیں پانچ ۔" بس پانچ روپے کا نوٹ وہاں پھینک کر چلتا بنا ۔

کہتے ہیں ایک بوڑھی بھکارن ایک دن ڈُمڈُما ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگ رہی تھی ۔ ایک نیگرو سپاہی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہی سپاہی نے ایک روپے کا نوٹ دے دیا ۔ جس ملک کے بھکاریوں کو تانبے کا ایک پیسہ دینے میں لوگوں کی نانی مرتی ہو وہاں کی بھکارن کو ایک روپیہ ملتے دیکھ کر سنتے ہیں کہ اسٹیشن کے موچیوں کی

آنکھیں پھیلی رہ گئی تھیں۔

چابوا ـــــ دِن جان میں تو ایک مرغے کی قیمت سات روپے تک دیتے کچھ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ضرور دنیا میں آگ لگ گئی ہے۔ بھیم دل ہی دل میں اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔

زندگی کے تجربات اور بڑھتی عمر کے باعث بڑے بابو شاکیہ پر کسی حادثے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پھر بھی یہ باتیں صحیح طور پر سمجھ میں نہ آنے کے باعث وہ کبھی کبھی بے چین ہو جاتے ہیں۔ گھر میں تنہا بیٹھے بیٹھے وہ کبھی کبھی ان ہی باتوں پر غور کرتے رہتے ہیں۔

اس دن شام ڈھل چکی تھی۔

شاکیہ ٹہل کر لوٹے۔ 'تتا باہنک' (باسک) کی سخت لکڑی کی چہار دیواری سے گھرے اس عظیم الشان 'ایل' ٹائپ کے پختہ مکان میں آدمی کی موجودگی کی کوئی نشانی نہیں تھی۔ نہ رہنے کی تو بات بھی ہے۔ بیوی کا انتقال ہوئے تقریباً تین سال ہو چکے۔ اکلوتی لڑکی کو دور بیاہ دیا ہے۔ اکلوتا لڑکا باکھر رات کے نو دس بجے سے پہلے گھر آتا ہی نہیں۔ گھر میں رہتا ہے صرف باورچی لڑکا بھیم چندر۔ وہ بھی اس حویلی میں آتا ہی نہیں، باورچی خانے ہی میں رہتا ہے۔ مکان کے سامنے کی طرف وہ اکثر جاتے ہی نہیں۔ گودھلی گوپال، 'کھری کاجائیں'، وغیرہ پھولوں کی جھاڑوں اور ہارسنگار کے دو پیڑوں والی پھلواری میں سناٹا سا چھایا رہتا ہے۔ برآمدے میں بھی اندھیرا اور سناٹا۔ باورچی خانے سے ملحق راستے سے ہی وہ اندر جایا کرتے ہیں۔ گھر کی لکشمی کے بنا یہ سونا گھر جیسے ان کے لیے بالکل بنجر اور ویران ہے۔

اندھیرے میں ٹٹول کر اندر کی طرف کے برآمدے میں بچھی آرام کرسی پر وہ بیٹھ جاتے ہیں۔ ہاتھ کی لاٹھی دیوار سے ٹکادی اور اس دن کا اخبار بغل میں لے لیا۔ اس کے سامنے والی حویلی کے مقابل ہے باورچی خانہ، ایک چھوٹی سی چھت سے جڑا ہوا۔ بھیم وہاں ہے، اس کا پتہ چلتا ہے۔ باورچی خانے کی اس بیداری سے ان کا دل خوش ہونا تو دور الٹے ان کی لمبی آہ نکل جاتی ہے۔ اسی باورچی خانے میں ان کی بیوی سارے کاموں سے فارغ ہو کر انہیں کھلایا پلایا کرتی تھی۔ اب اس کی جگہ باورچی بھیم چندر نے

لے لی ہے جسے وہ بڑے صاحب کی اجازت لے کر کل گھر (کارخانے) سے لے آئے ہیں۔ بھیم چندر سے وہ غیر مطمئن نہیں ہیں۔ انہیں تو غم اسی بات کا ہے کہ باکھر کی ماں انہیں چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی۔ پریم کی زنجیر کا بندھن بڑا سخت ہوتا ہے جو آرام و تکلیف میں یکساں رہتا ہے۔ جنگ کی یہ دنیا ان کی پُرسکون زندگی کو غارت کرنے والی ہے، شاید اس کی ہی اطلاع دینے کے لیے باکھر کی ماں انہیں تین سال قبل چھوڑ کر چلی گئی۔

کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد انھوں نے آواز دی:

"بھیم"

"جی بابوجی!" باورچی خانے سے بھیم نے جواب دیا۔

"لا چلم بھر کر لے آ۔"

مضمحل جسم کو اٹھا کر انھوں نے دیوار پر کا سوئچ آن کر کے بتی جلا دی اور چشمہ لگا کر اخبار سامنے پھیلا لیا۔ ملک کے حالات ایک دم اچھے نہیں۔ سرحد پر خوفناک جنگ ہو رہی ہے۔ جاپانی فضائیہ نے ہندوستانی سرحد پر سراسیمگی پھیلا رکھی ہے۔ کس وقت سائرن بجا کر دہشت زدہ کر دے، پتہ نہیں۔ آسام میں رہنے والے بہت سے لوگ جان بچانے کے لیے مغرب کی طرف بھاگ گئے ہیں۔

بھیم بڑی پھرتی سے چلم میں تمبا کو سلگا کر لے آیا۔ انھوں نے پوچھا:

"کیا بن رہا ہے رے آج؟"

"کچھ بھی تو نہیں ہے۔ صرف انڈے ہیں۔"

"مچھلی ختم ہو گئی!"

"ایک مانگور مچھلی تھی، مر کر سڑ گئی، پھینک دی۔" کہہ کر بھیم چندر چلا گیا۔

شاکیہ تمباکو پیتے رہے۔ دھوئیں کے درمیان ہی اخبار پڑھتے گئے۔

کونے میں بیٹھا ہوا کتا ایک بار اچانک بھونکنے لگا۔ دو آدمی برآمدے کی طرف آگے بڑھے آ رہے تھے۔ اس طرف سر اٹھا کر دیکھتے ہوئے شاکیہ نے آواز دی:

"کون؟"

"ہامرالاگی مالک !" (ہم ہیں مالک) ان لوگوں نے کہا۔

"کون بکل اور بدھو ؟"

دونوں نے ایک ساتھ کہا ___ "جی"

"یہ رات کے وقت تم لوگوں کو کیا چاہیئے ؟"

بکل بولا ___ "ذرا کام ہے مالک۔ ایک بات جاننے آئے ہیں۔ ارے بدھوادھر آنا ___ مالک ہم ذرا یہیں بیٹھیں۔"

"ٹھیک ہے۔ بیٹھو۔"

بکل اور بدھو دونوں برآمدے میں جاکر شاکیہ سے تھوڑی دور زمین پر ہی بیٹھ گئے۔ چورکی بونہ پاکر کتا بھی دوستی بڑھانے کے لئے دم ہلاتا ہوا پاس چلا آیا۔ بدھو نے اسے اپنے پاس کھینچ لیا۔ شاکیہ پھر تمباکو پینے اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ پوچھا:

"بتاؤ تو کیا کام ہے تم لوگوں کا ؟"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر بدھو نے کہا:

"مالک، سنا ہے 'فل' میں آدمی لے رہے ہیں ؟"

'فل' میں یعنی فیلڈ میں۔ مطلب ہوائی اڈے میں۔ آسام کی بیرونی وادی کے چھوٹے سے شہر ڈمڈما کے پاس چوکیرٹی میں نیا ہوائی اڈہ بن رہا ہے۔

شاکیہ نے پوچھا ___ "تو پھر ؟"

بدھو بولا ___ "مالک بھی تو وہاں قلی بھیجتے ہیں نا ؟"

"ہاں، تو پھر ؟"

بکل بولا ___ "ہمارا نام بھی لکھا دیں مالک۔ ہم بھی 'فل' میں کام کرینگے غریب پر ذرا رحم کریں تو بھلا ہو جائے مالک۔"

گڑگڑاتے ہوئے حقّے سے شاکیہ چپ چاپ دھواں نکالتے رہے۔ خیر جان چائے بگان کے قلیوں کا ان کے پاس آنے کا یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ چوکیرٹی کا ہوائی اڈہ بنانے کے لئے کافی مزدور چاہئیں۔ آس پاس کے چائے بگان ہی مزدور فراہم کر رہے ہیں۔ دوست ملکوں کی جنگِ عظیم ہے۔ انگریز چائے مزدوروں کی فراہمی کے لئے آگے بڑھ آئے ہیں۔ خیر جان چائے بگان سے مزدوروں کے نام لکھوا کر

حکام اور سرداروں کے ماتحت کام کرنے کے لئے بڑے بابو شاکیہ ہی قلی بھیجا کرتے ہیں ۔ ملٹری والے مزدوری بھی کافی دیا کرتے ہیں اسی لئے فیلڈ میں کام کرنے کے لئے مزدوروں میں جوش وخروش بھی زیادہ ہے اور اسی وجہ سے چوری چھپے شاکیہ کے پاس آکر نام درج کرانے والوں کی تعداد بھی کافی ہے ۔

بکل نے دھوتی کی گرہ سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر شاکیہ کے سامنے خالی مونڈھے پر رکھ دیا۔ شاکیہ نے چشمے کے پیچھے سے اس طرف ترچھی نظر سے دیکھا۔

بدھو بولا ـــــ " مالک ہمارے ماں باپ آپ ہی ہیں، مالک!"

" تم سب فیلڈ میں کوئی گڑبڑ تو نہیں کروگے نا ؟"

" نہیں، نہیں مالک ۔ بھلا گڑبڑی کیوں کریں گے ؟" یکبارگی دونوں بول اٹھے جیسے انھوں نے کوئی بہت حیرت ناک بات سنی ہو ۔

شاکیہ بولے ـــــ " سردار بابو کے ساتھ جھگڑا تو نہیں کروگے نا ؟"

" نہیں، نہیں مالک ۔ جھگڑا کریں گے کیوں ؟ آپ ہمیں جانتے ہی ہیں مالک ۔ اتنے دنوں نمک کھایا ہے ۔ کسی دن کیا کوئی گول مال کرتے دیکھا ہے ؟"

شاکیہ نے دیکھا ضرور ہے ۔ بکل اور بدھو جیسا شراب پی کر لڑائی جھگڑا کرنے والا خیر جان چائے بگان میں اور کوئی نہیں ہے ۔ ان کے نمک کھانے والی بات بھی بالکل جھوٹی ہے ۔ یہ بھی انہیں معلوم ہے ۔

کتا پھر سے بھونکنے لگا تھا ۔ تینوں نے سر اٹھا کر دیکھا ۔ سائیکل لیے کوئی آرہا تھا ۔ شاکیہ نے آواز دی ـــــ

"کون ؟"

" میں ہوں بابوجی !"

"او ، باکھر !"

سائیکل ایک کونے میں رکھ کر باکھر برآمدے میں آگیا ۔ اس کے ہاتھوں میں کتابوں کا ایک بنڈل تھا ۔

شاکیہ نے پوچھا ـــــ " کہاں گیا تھا بھلا ؟"

یہی سوال وہ اس سے ہمیشہ کیا کرتے ہیں ۔ وہ بھی ہمیشہ جو جواب دیتا

تھا اسے ہی دہرا دیا ـــــ یہی ذرا گھوم پھر آیا۔ ڈمڈما سے کچھ کتابیں لے آیا۔ پھر اس نے بکل اور بدھو کی طرف دیکھ کر پوچھا:

"کیوں رے، شاید تم سب کو کام چاہیئے؟"

دونوں ہنسے۔ باکھر اندر چلا گیا۔ مونڈھے پر رکھے پانچ روپے کے نوٹ پر اس کی نظر پڑی تھی۔

بکل نے پوچھا ـــــ "مالک آپ کا لڑکا پاس کر آیا ہے نا؟"

شاکیہ نے کچھ طمانیت اور لاپرواہی سے کہا:

"ہوں، وہ بی اے پاس کر آیا۔"

"بی۔ اے۔! اوہ! بہت پڑھ لیا۔ ٹھیک ٹھیک۔ اچھا ہوا۔"

دراصل بی۔ اے کہنے پر بکل تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ مالک کے بیٹے نے یہ کارنامہ سر انجام دیا ہے اسی لیے اس نے اسے اچھا کہہ دیا۔

"ہاں، اب وہ کیا کرتا ہے؟"

بدھو نے جواب دیا ـــــ "ڈمڈما میں ماسٹری کر رہا ہے نا!"

بکل بولا ـــــ "کیا؟ سب ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔"

شاکیہ نے انھیں رخصت کر دیا۔ مہربانی کرنے کی ایک بار اور یاد دہانی کر کے وہ دھیرے دھیرے اٹھ گئے۔ ہاتھ پیر دھو کر باکھر بھی شاکیہ کے پاس آ بیٹھا اور اخبار لے کر نظر دوڑانے لگا۔ ایک تپائی کھسکا کر بھیم دو کپ چائے رکھ کر چلا گیا۔

شاکیہ بولے ـــــ تجھے ایک بار بٹیا کے یہاں ہو آنا تھا۔ بار بار لکھ رہی ہے۔ ایک بار وہاں ہو آ۔"

"جاؤں گا کبھی۔" مدھم آواز میں باکھر بولا ـــــ "مجھے تو ابھی چھٹی نہیں۔ اسکول میں ماسٹر ہیں ہی نہیں۔ اسٹاف کے ہم تین ہی آدمی کسی طرح کام چلائے جا رہے ہیں۔"

شاکیہ نے کچھ کہے بغیر چائے کا کپ ہاتھ میں اٹھا لیا۔

پتا کو اکیلا چھوڑنا مشکل تھا اسی لیے نہیں جا سکا۔ بی۔ اے کا امتحان دینے کے

بعد تقریباً سال بھر سے وہ ڈمڈما اسکول میں ہی کام کر رہا تھا۔ چھوٹی سی جگہ کے مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ معقول نہیں ہوتی مگر اس نے روپے کے لیے ماسٹری کا پیشہ اپنایا ہے، نہ باکھرا ایسا سوچتا ہے اور نہ دوسرے لوگ۔ خاص کر لڑائی کے زمانے میں جب کہ لوگوں کے ہاتھ روپے پیسے آرہے ہیں، ایسی بات سوچنے کی فرصت ہی کسے ہے۔

شاکیہ نے اس سے سرکاری نوکری ڈھونڈنے کے لئے کہا تھا یا اور کہیں اچھی جگہ پانے کی کوشش کرنے کی صلاح دی تھی مگر اس نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ تحریکِ آزادی میں کبھی شامل نہ ہونے کے باوجود بھی اسکول کی تعلیم کے ہی زمانے سے وہ سوچتا آیا تھا کہ سرکاری نوکری کرنا برا ہے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس جیسے نوجوان کو سرکاری نوکری ملے تو اسے نہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لیے سرکاری نوکری کی بات چلتی تو وہ خاموش رہتا۔ دل کی بات کہنے میں بھی اسے تامل ہوتا ہے اگر چہ اس جذبے کو دبانا بھی مشکل ہے۔

اسے بھی بخوبی علم ہے کہ ایک دن شادی بیاہ کرکے گھر چلانا ہوگا۔ پتاجی تو ہمیشہ زندہ رہیں گے نہیں۔ زندگی بھر بیٹھے بیٹھے کھاتے پیتے رہیں ایسے خوش حال بھی وہ نہیں ہیں۔ اسی لیے مڈل اسکول کی نوکری سے وہ مستقبل میں کیا کر سکے گا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ سوچنے پر اسے خوف کا بھی احساس ہوتا ہے۔

ایسے وقت میں وہ اپنے کو بہت کمزور پاتا۔ کوئی دوسری نوکری کرنے یا لڑائی کے ٹھیکے کا کام کرنے کی لوگ اسے صلاح دیا کرتے۔ پھر ان میں سے ایک بھی کام کرنا اسے پسند نہیں۔ سبھی کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس اسکول میں پڑے رہنے پر تو تمہارا کچھ بھی ہوگا نہیں۔ سبھی کی باتوں کو ہنسی میں اڑا دینے کے لیے وہ پُر مذاق انداز میں کہہ دیتا:

"ٹھیک ہے، میرا اگر کچھ نہیں ہوتا تو نہ سہی، ان لڑکوں بچوں کا تو کچھ ہوگا نا آخر۔"

بزرگ اور تجربہ کار لوگ کہا کرتے ہیں —— سمجھے نا باکھر، تم اگر نہ بھی رہو تو اسکول مرے گا نہیں۔ مینجنگ کمیٹی تو ہے نا؟ تم تعلیم یافتہ نوجوان ہو، ابھی کسی اچھے کام میں دل لگانا چاہیے۔ تجارت میں بھی ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جٹ جانا

چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔اس بات پر بھی باکھران کا احترام کرتے ہوئے مذاق کرنے کی کوشش کرتا ــــــ تجارت کا مطلب لڑائی کا ٹھیکہ ہی ہے نا ؟ لڑائی ہوتی ہے لوگوں کو مارنے کے لیے۔ پہلے زمانے میں تو خیر چاہے جو ہو صرف فوجی سپاہی ہی مرا کرتے تھے مگر آج کل تو بم گرنے پر بے قصور عوام اور ننھے ننھے بچے بھی مرجاتے ہیں۔ابھی ابھی اس دن جاپانیوں کے بم گرانے سے تارا بگان میں سائیکل سے جاتے ہوئے اس دکان دار کے مرنے کی بات کیا تم لوگوں نے نہیں سنی ؟ کیا مجھے بھی ایسے ہی غلیظ کام کے لیے آگے بڑھنے کو کہتے ہو ؟

باکھر کی یہ نصیحت آمیز باتیں سن کر دوست احباب کہا کرتے ہیں ــــــ باکھر تمہاری باتیں سن کر تو ایسا لگ رہا ہے کہ ویدک یگ کے رشی منی اب بھی باقی ہیں۔

پتاجی خاص بات نہیں کرتے۔لوگوں کی باتیں انہیں سچ ہی معلوم ہوتی ہیں حالانکہ بیٹے سے انہیں ذہنی عقیدت ہے۔ وہ ہمیشہ خاموش رہتے ہیں سبھی کی باتیں بس سن لیتے ہیں۔کوئی رائے دینی ہو تو دھیرے سے دے دیتے ہیں۔کسی کو تکلیف پہنچانا ان کی عادت نہیں ہے۔ان کا نظریہ بس یہ ہے کہ روپیہ کمانا چاہیے۔ لڑائی کے موقع پر کم وقت میں لوگوں کو بہت روپیہ کمانے کا موقع ملا ہے۔اسلیے باکھر اگر اس لڑائی میں ٹھیکے کا کام لے لے تو ان کے خیال میں یہ کوئی بری بات نہ ہوگی لیکن تعلیم یافتہ بیٹے کے ذہن میں بھی کوئی اچھا خیال ہو سکتا ہے، یہ بات بھی وہ ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے اسی وجہ سے دوسروں کی طرح وہ باکھر پر دباؤ نہیں ڈالتے تھے۔

کتا تیسری بار بھونکنے لگا۔

کوئی آدمی آرہا تھا۔شاکیہ نے اس طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ــــــ

"کون ؟"

اس آدمی نے جواب دیا ــــــ

"ہامی لاگ بڑکرانی بابو (میں ہوں بڑے کرانی بابو)۔"

"کون منگرا ؟"

"جی مالک !"

"کیا چاہیے ؟"

"یہی ذرا کام سے آیا ہوں۔"

باکھرا اٹھ کر اندر چلا گیا۔ ایک کتاب کھول کر پڑھنے کی کوشش کی لیکن پڑھ نہیں سکا۔ منگرا نام کے آدمی کا کام کون سا ہے وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ وہ اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔

ہٹلر نے پولینڈ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ یورپ میں جنگِ عظیم کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اٹلی نے مغلوب فرانس پر شمال کی جانب سے حملہ کر دیا۔ متحدہ ریاست امریکہ نے ملک میں موجود جاپانی جائداد ضبط کر لی، اسی وجہ سے جاپان نے خاموشی سے جرمنی اور اٹلی سے خفیہ معاہدہ کر کے ایک دن اچانک امریکی پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ ایشیا میں جنگ چھڑ گئی۔ جنگ، عالمی جنگ بن گئی۔ جاپان نے چین کے بہت سے مقامات پر حملہ کر دیا۔ ہند چین پر حملے کر کے جنگی اڈے بنائے سنگاپور کا خاتمہ ہو گیا۔ برما پر قبضہ ہو گیا اور عالمی جنگ آسام کی سرحد تک آپہنچی۔

اسی وجہ سے ایسا بھی دن آگیا جب کہ ڈنڈما کے پوکیرٹی گھوڑ دوڑ میدان اور اس سے ملحق پوکیرٹی چائے بگان میں ہوائی اڈہ بنا۔ دن جان اور چابوا میں تو فوجی اڈے بن ہی چکے تھے۔ مغرب کی پچھوا ہوا سے مشرق جیسے چنچل ہوا اٹھا۔ ڈنڈما حقیقتاً غیر ملکی فوجیوں کا شہر بن گیا۔ اب تک تو چائے بگانوں کے کام کاج کی نگرانی کرنے والے گورے صاحب ہی یہاں دکھائی پڑتے تھے۔ ڈنڈما کے یورو پین کلب میں انھیں اگر اکٹھا کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو افراد رہے ہوں گے۔ انھیں کے جیسے جھنڈ کے جھنڈ گورے لوگوں نے آکر ڈنڈما کی ہیئت بدل دی تھی۔ خاص کر بگان کے چائے مزدوروں کے لیے کھولی گئی چھوٹی چھوٹی دوکانیں، لکڑی اور ٹھیکیداری کے دھندے، ایک بے رونق سا مڈل اسکول، چند رؤسا کی موٹر گیراج، ٹاؤن کمپنی کے آفس اور کیروسن کی تبیوں والے لیمپ پوسٹ۔ بس! کل بیس منٹ میں جس کی سبھی سڑکوں کی سیر کی جا سکتی ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں زندگی جو بس چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہی تھی، وہ جیسے اچانک ہی شعلۂ جوالہ بن کر روشن ہو گئی۔ زندگی کی گردش اس شہر میں بہت تیز ہو گئی۔ لمبے، ناٹے، کالے، سفید، پیلے سبھی طرح کے فوجیوں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی فوجی پوشاکیں اور ساز و سامان اپنا رنگ دکھانے لگے۔ جیپ، ٹین وھیلر، کرین،

ہوائی جہاز، طیارے، توپیں، گھر بنانے کا سامان، کول تار کے پیپے، کنکر پتھر، بانس، پلاسٹر اور بھی نہ جانے کیا کیا آپہنچا۔ فوجیوں کے خرچیلے مزاج پر سب کی نظر ہے۔ مہینے میں دس بارہ روپے پانے والے چائے بگان کے مزدور اور مہینے میں بیس پینتیس روپے پانے والے کلرک حیرت سے سنا کرتے ہیں کہ ایک 'رباب' لیموں کی قیمت پانچ روپے ملتی ہے۔ ایک مرغ کا دام سات روپے اور بوڑھی بھکارن کو بھیک ملتی ہے ایک روپیہ! اتنے خرچیلے سپاہیوں کے مالکوں کے پاس ضرور دولت کا انبار ہوگا۔ اس درمیان خبر آتی ہے: فیلڈ میں کام کرنے والے مزدوروں کو ایک روپیہ چار آنہ یومیہ کے حساب مزدوری ملے گی۔ کچھ اوپری بخشش تو ہے ہی۔ سستے داموں راشن ملے گا! چاروں طرف سے چائے بغیچوں اور بستیوں سے مزدور طبقہ کے لوگ چوکیرٹی کی طرف دوڑ پڑے۔

—— جائیں گے تو بھلا جائیں گے کیوں نہیں۔ باکھر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ بگان میں مزدوری ملتی ہے یومیہ چھ آنے اور فیلڈ میں ملتی ہے ایک روپیہ چار آنے۔ حالانکہ زندگی بھر اس چھ آنے پر ہی لوگ قناعت کرتے آئے ہیں۔ پھر بھی زیادہ پانے کی کیا انسان کو خواہش نہیں ہوتی۔ دولت مند کے دل سے کیا مزید دولت پیدا کرنے کی خواہش کبھی ختم نہیں ہوسکتی ہے۔

سب لوگوں کی طرح پتا جی بھی اسی رو میں بہہ گئے ہیں۔ شاکیہ بھی تو آخر انھیں جیسے آدمی ٹھہرے! شاید وہ بھی کبھی غریب ومفلس ہی رہے ہوں گے لیکن جائز وناجائز سبھی طریقے اختیار کرکے انھوں نے اپنی ایک دنیا بسائی ہے، باعزت مقام حاصل کیا ہے، ایک سیڑھی اوپر آسکے ہیں۔ وہ نہ لالچ چھوڑ سکتے ہیں، اور نہ حاصل کیا ہوا مقام ہی گنوا سکتے ہیں اس لئے درپردہ وہ بھی بدعنوانیوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ رشوت لے کر بدھو، بکل، منگرا وغیرہ کا 'اپکار' کرتے جارہے ہیں۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد بھیم چندر باکھر کے پاس آیا۔ وہ رات کو باکھر کے پاس جاکر لکھتا پڑھتا اور پھر لائن بستی میں نہ جاکر شاکیہ کے یہاں ہی سو رہتا باکھر نے کتاب کا صفحہ کھول کر کہا ——

"ہاں آج ا ی کو لکھو۔"

لیکن بھیم نے کچھ آنا کانی سی کرتے ہوئے کہا ——

"نہیں بھیا ، میں آج لائن میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں ؟" باکھر نے حیرت سے پوچھا۔

بھیم نے سنجیدہ ہو کر کہا ___

"مجھے تو اب اکثر لائن میں جاتے ہی رہنا پڑے گا بھیّا ، سنتا ہوں یہ گورے سپاہی کبھی کبھی بہت پریشان کرتے ہیں۔ ہمیں لائن میں پہرہ دینا پڑے گا۔"

باکھر کو شبہہ ہوا کیونکہ پہلے بھی دو دن اسی طرح عذر کر کے وہ لائن میں گیا تھا۔ اسے جیسے بھید کا پتہ چل گیا۔ طنزیہ انداز سے مسکرا کر کہا ___

"یا اس چھوکری کے ساتھ گپیں لڑانے جاتا ہے۔ نام کیا ہے اس کا ___ گوری یا کیا ؟"

بھیم نے شرم سے سر جھکا کر سرگوشی کے انداز میں کہا ___

"زیادہ زور سے نہ بولیں بھیاجی ، بابوجی سن لیں گے۔" اس نے اس طرح کہا جیسے پتاجی سن لیں گے تو اس کا ڈر باکھر کو نہیں ہے ___ "تم تو جانتے ہی ہو میں ان سب میں نہیں ہوں۔" بھیم نے صفائی دیتے ہوئے کہا ___ مگر ماں بہن کی عزت رکھنے کے لیئے لائن میں پہرہ دینا ہی ہوگا بھیاجی !"

باکھر جانتا ہے۔ حقیقت تو وہی ہے کہ گوری سے ملنے کے لیے آج کل وہ جلدی جلدی لائن کا چکر لگانے لگا ہے۔ لائن میں وہ شاید پہرہ دیتا ہے لیکن اس کا مقصد ماں ، بہنوں کی عزت بچانے سے زیادہ گوری کے درشن کرنا ہے۔ محنت کش نوجوان بھیم چندر کو جوانی کی ہوا لگ چکی ہے۔ لائن (بستی) کا سماج اسے اب گھر میں قید نہیں رکھ سکتا۔ رکھنے کی بات بھی نہیں سوچ سکتا۔ ہوا سے پیڑ کے پتے تو ہلیں گے ہی۔ سنتے ہیں گوری نام کی لڑکی سے بھیم کی دوستی بہت بڑھ گئی ہے۔ پہلے تو وہ کبھی کبھار ہی لائن میں جایا کرتا تھا اور آج کل تو کبھی کبھار ہی جائے بغیر رہ پاتا ہے۔ شاکیہ کو ان سب اندرونی باتوں کا پتہ نہیں۔ باکھر کو کسی طرح پتہ چل گیا ہے۔

بھیم کو لائن میں جانے کی اجازت دے کر باکھر نے ایک سگریٹ سلگائی اور کھلی کھڑکی سے باہر کی طرف خلا میں دیکھتے ہوئے کچھ وقت گذارا۔ نیلگوں آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہوئے ایک روشن ستارے پر نظر پڑتے ہی

اس کا دل بے تاب ہو اٹھا۔ ایک سندر سا چہرہ سامنے آ گیا — انوپما کا چہرہ۔
انوپما کے ساتھ اس کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ حال ہی میں وہ اسے دیکھ بھی آیا ہے۔ پتا جی کے زور ڈالنے پر ہی وہ اسے دیکھنے گیا تھا۔ انوپما کے ماں باپ بھی 'سیر سپاٹے' کے لیے مسلسل بلا رہے تھے۔ ان کے یہاں خاطر مدارات کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ مقصد کیا ہے۔ اب بابا اگر منظوری دیدے تو شادی کی تاریخ طے کی جا سکتی ہے۔

لیکن یقینی طور پر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بتا نہیں پایا۔ سوٹ کیس سے ایک لفافہ نکال کر پہلے کا پڑھا ہوا خط وہ پھر سے پڑھنے لگا —

شاکیہ!

آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کروں، سوچ کر طے ہی نہیں کر پاتی ہوں۔ پتہ نہیں 'شاکیہ' لفظ سے مخاطبت آپ کو مطمئن کر سکے گی یا نہیں، کیا بتانے کی زحمت کریں گے؟

ہمارے یہاں آکر آپ کو کیسا لگا، پتہ نہیں۔ پتہ نہیں آپ اپنے من میں ہمیں کس شکل میں لیے ہوئے ہیں۔ ایک ہفتہ رہ کر آپ کے چلے جانے کے بعد گھر بالکل سونا سونا سا لگ رہا ہے۔ بھلا کیوں؟ کہاں، پہلے تو ایسا نہیں لگتا تھا۔ آدھی رات کو جب میں پڑھ رہی تھی تو اچانک آپ کو خط لکھنے کی خواہش ہوئی۔ آج شام کو اکیلی بیٹھی اپنے کمرے کی مغربی سمت کی کھڑکی سے دور سورج کو ڈوبتا دیکھ رہی تھی۔ انجانے میں ہی کہیں کھو سی گئی۔ ہوا کے ایک جھونکے نے نہ جانے کس انجانے جنگلی پھول کی مہک لاکر مجھے پاگل بنا ڈالا۔ مگر کیا وہ پھول ہمیشہ انجان ہی بنا رہے گا؟

ان کئی دنوں میں بیٹھی 'پرائیڈ اینڈ پریجوڈس'، 'لوسٹ ہورائزن'، وغیرہ پڑھتی رہی ہوں، کھایا پیا ہے اور سوتی رہی ہوں، سپنے دیکھتی رہی ہوں، مگر کس کے؟ ہمارے لاشعور میں کس کے سپنے بسے ہوتے ہیں۔ بھلا مجھے کیسے پتہ چل سکتا ہے؟ پاپینویس

کے لاشعور میں مایا چھپی ہوتی ہے۔ اس کا پتہ تو خود اسے بھی نہ تھا۔۔۔
آپ تو شاید خود کو کاموں میں مصروف رکھ کر بہت خوش ہیں نا؟

—— انوپما

کتاب پڑھنے کی خواہش ختم ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ ذہن کو بس اسی رو میں بہنے دے۔

جنگ سر پر آپہنچی ہے۔ ٹھیکیدار بے پناہ دولت کما رہے ہیں۔ بدھو، بکل اور منگر جیسے لوگ رشوت دینے لگے ہیں۔ آج کی دنیا کی راہ تو یہی ہے۔ یہی تو طریقہ ہے۔ صرف وہی اس راہ پر نہ چل کر متنازعہ شخصیت بنا ہوا ہے۔ جنگ کے پرکشش جال میں وہ نہیں پھنس سکا ہے لیکن وہ کسی کو اس سے روکنا بھی تو نہیں چاہتا۔ آج کی دنیا میں اس کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ وہ قیمت چاہتا بھی نہیں۔ لیکن اس پر بھی وہ خود کو مطمئن نہیں کر پاتا۔ یہی تو اسے صدمہ ہے۔ اسے کوئی غیر معمولی یا منفرد سمجھنے کو تیار نہیں ہے۔ پھر عام یا معمولی ہونے کی اس کی خواہش نہیں ہے۔ وہ تو بس محض ایک متنازعہ شخصیت بنا ہوا ہے!

انوپما نے بھلا اسے کیوں پسند کر لیا؟ ایک مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر میں بھلا اس نے کون سی خوبی دیکھ لی؟ سپنے؟ کالج میں پڑھنے والی معصوم لڑکی کے تصورات کی رو میں بہہ کر انوپما نے کہیں غلطی تو نہیں کی؟ لیکن باکھر نے اپنی ساری باتیں اس کے سامنے کھول کر کہہ دی ہیں۔ انوپما نے سن کر فخریہ لہجے میں کہا——
" آپ کی قیمت ہے پر دام نہیں۔ آپ مجھے اس بات پر یقین کیوں نہیں کرنے دیتے؟"

بتی بجھا کر وہ بستر پر لیٹ گیا اور دل ہی دل میں پکار اٹھا——'انوپما' انوپما، گُکی!' گکی انوپما کا گھریلو پکار کا نام ہے۔ کافی رات تک اسے نیند نہیں آئی۔

دوسرے دن سویرے ڈیوٹی کی خبر دینے والے سائرن کی کربہہ آواز گونج اٹھی۔ شاکیہ چھ بجے صرف ایک پیالی چائے پی کر دفتر روانہ ہوتے تھے۔ آٹھ بجے کے قریب ٹھیک سے چائے ناشتہ کرنے کے لیے لوٹیں گے۔ بھیم پو پھٹنے سے پہلے ہی لوٹ آیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت کل گھر (کارخانہ) کا سائرن

بج اٹھا۔ سائرن کی کانپتی ہوئی آوازیوں ہی لوگوں کے دل میں خوف کی لہر دوڑا دیتی ہے باڑے کے کونے میں بنائی گئی 'ٹرینچ' کے اندر شاکیہ ، باکھر، بھیم تینوں جا گھسے کھائی کے اندھیرے میں چندھیائی آنکھیں کچھ دیکھ پائیں کہ اس سے قبل ہی چوتھا آدمی ان کے پیچھے پیچھے گھس پڑا۔ تینوں سمجھ گئے کہ کوئی گھسا ہے مگر ہے کون ، کوئی پہچان نہیں پایا۔

بھیم بولا ــــ

"بڑے بڑے ہوائی جہاز جب زیادہ تعداد میں اڑنے لگے تھے تبھی میں سمجھ گیا تھا کہ جاپانی آپہنچے ہیں۔"

باکھر صرف ہوں کہہ کر اندھیرے میں ہنس پڑا۔ 'ریڈ سگنل' پڑتے ہی چکے چوکیر ٹی کے 'ٹریس پورٹر'، طیاروں کو دوسرے محفوظ مقامات پر لے جایا جاتا ہے۔

شاکیہ نے کہا ــــ

"صبح صبح ہی نحس رخنہ پڑ گیا۔ دن میں کیا ہو، کون جانے ؟ کہاں ! جا پا نی ہوائی جہاز آرہے ہیں کیا ؟"

چوتھا پناہ لینے والا شخص اب تک خاموش تھا۔

دشمن کے آنے کی کوئی آہٹ نہیں ملی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد خطرہ ٹل جانے کا اشارہ سائرن کی آواز نے دیا۔ اس آدمی کے ساتھ ہی تینوں کھائی سے باہر نکل آئے ۔ کھلی جگہ میں آکر ہی ان لوگوں نے اس اجنبی شخص کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ وہ نوجوان تھا۔ گہری نیل میں ڈبوئی ہوئی دھوتی، جو کافی میلی ہوچکی تھی اور ایک سستی سی ریڈی میڈ قمیص پہنے ، ننگے پیر، چہرہ بھولا بھالا سا۔ بالکل خاموش تب پتہ چلا کہ وہ سائرن کی آواز سن کر پناہ لینے والا راہی نہیں بلکہ شاکیہ کے یہاں آیا ہوا مہمان ہے۔

"کون ہو جی !" کہہ کر شاکیہ نے چشمہ لگالیا۔

نوجوان جو اب تک نظر جھکائے ہوئے تھا سرگوشی کے انداز میں بولا ــــ

"میں ہوں موسا جی۔"

"کون، گریلا ؟" ــــ شاکیہ اتنی دیر بعد اسے کچھ کچھ پہچان گئے تھے۔

"جی !"

"تو صبح صبح یہاں کیسے آپہنچا ؟"
"یہاں تک آیا تھا۔ رات کو اسٹیشن پر رہ گیا۔"
"ٹھیک ہے۔ آبیٹھ !"
شاکیہ کے لہجے میں ذرا بھی اپنائیت نہیں تھی۔ پھر بھی مہمان آنے کی وجہ سے انھیں برا لگا ہو، ایسا ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ پوچھ تاچھ کرنے میں وہ کافی تجربہ کار ہو چکے تھے۔ دل میں برا لگنے پر بھی زبان سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے۔ مہمان وغیرہ خاص طور پر غیر ضروری لوگ انہیں پسند نہیں آتے۔ لیکن گاؤں کے لوگوں کے ساتھ تعلق تو بنائے ہی رکھنا پڑتا ہے۔ نوکری چھوڑنے کے بعد تو انہیں گاؤں ہی لوٹ جانا ہے۔ کوئی دور کا رشتہ دار ہونے کے ناطے یا گاؤں میں جس طرح رشتے بنا لیے جاتے ہیں اسی طرح سے یہ نوجوان بھی 'موسا' کہہ کر ان کا مہمان بنا ہے۔ اس کی تفتیش کرنے سے کیا حاصل ؟
اس لیے انھوں نے بٹھا کر دو چار اچھی بری باتوں کی کھوج خبر لے کر کہا کہ دفتر جانے میں دیر ہو رہی ہے اور اسے باکھر کے سپرد کر کے نکل گئے۔

باکھر نے مہمان کے پاس بیٹھ کر کہا ـــــ
"میں تجھے پہچانا ہوا سا لگ رہا ہوں کیا ؟"
نوجوان نے بلا تامل کہا ـــــ
"تجھے بھی کیا پہچاننا پڑے گا بھلا ؟ تم تو باکھر بھیا ہو نا ؟"
"ہوں، مگر میں تو تجھے اچھی طرح پہچان بھی نہیں پایا۔ گاؤں میں تو کم ہی گیا ہوں نا اس لیے لوگوں سے ٹھیک سے شناسائی بھی نہیں۔ نام کیا ہے تمہارا ؟"
'گرین !'
"ہوں ـــ کس مقصد سے آئے ہو ؟ ارے بھیم دو کپ چائے لے آ"
گریلا عرف گرین بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے شرمندگی کے آثار نمایاں تھے۔ باکھر ایک کتاب کے اوراق الٹتے ہوئے ترچھی نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ تیز دھوپ اور موسلا دھار بارش کے مظالم سہہ کر کالا پڑ جانے والا جسم، تنومند نہ ہونے کے باوجود اس کے قویٰ مضبوط تھے۔ پیر کی انگلیوں کے

ناخنوں کو کھیت کی کیچڑ نے بالکل کھا ڈالا تھا۔ پیروں میں گھٹنے تک نہ جانے کس چیز کے
کالے کالے سے دھبے۔ باکھر نے دل ہی دل میں کہا ــــ ہل بیل سے دیش کی مٹی کو
کھود کھود کر شاعروں کے خوابوں کے سنہرے دھان اگانے والے ــــ کھیتوں کی
تعمیر کرنے والے اصلی کلاکار یہی ہیں۔

"آنے کا سبب کچھ تو مجھے بتا یا نہیں گرین؟"

"اگر کچھ کام دھام ملے تو کرنے کے لیے آیا ہوں، بھیا جی۔"

"کیا ملٹری کے کام؟"

گرین اب ذرا کھل گیا تھا۔ بولا ــــ

"جی!"

باکھر ہنس پڑا۔ پوچھا ــــ

"تب تو لڑائی کی ہوا گاؤں میں بھی پہنچ چکی ہے، کیوں؟"

گرین نے کہا ــــ

"جی، ہوائی جہاز تو ہمارے گاؤں کے اوپر سے اڑ اڑ کر جایا کرتے ہیں۔ پہلے
دن تو لوگ جھنڈ بنا کر دیکھ رہے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ہوائی جہاز کو 'رتھ' کہتے
ہیں۔ بانس لانے کے لئے سپاہی بھی بیچ بیچ میں گاؤں آجایا کرتے ہیں۔"

بھیم نے چائے ناشتہ لا دیا۔ گرین کو بہت تامل ہوا ــــ چھی! اس قلی نوکر
کا بنایا ہوا چائے ناشتہ بھی کیا کھایا جا سکتا ہے؟ حالانکہ بھیم کے کپڑے اس
کے کپڑوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ صاف ستھرے اور سلیقے کے تھے۔
لیکن باکھر کو کھاتے دیکھ کر وہ بھی کھانے پر مجبور ہو گیا۔ عذر کر کے وہ میزبان
کا دل توڑنا اور بے وقوف بننا نہیں چاہتا تھا۔ چائے پی کر، پان سپاری بٹہ
مانگ کر تا موچ (کچی سپاری) کاٹتے ہوئے اس نے پوچھا ــــ

"بھیا جی نے تو شاید کالج پاس کر لیا ہے نا؟"

"ہاں، بی۔ اے۔ تو پاس کیا ہے۔"

"پھر پڑھنے جاؤ گے نا؟"

"نہیں ــــ سوچتا ہوں اب نہیں جاؤں گا۔ پتا جی کی عمر ڈھل آئی ہے۔ انہیں
اکیلا چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگتا۔"

کچھ دیر تک چپ چاپ تامول کاٹتا ہوا گرین بولا ـــــ

"میں نے بھی ساتویں تک پڑھ کر چھوڑ دیا۔"

"آخر کیوں ؟"

'جی ہم گاؤں کے لوگوں کی بات نہ کہیں ۔گھریلو معاملات میں پڑ کر پڑھائی ہی چھوڑ دینی پڑی ۔" گرین نے لمبا سانس لیا۔

باکھر نے پوچھا ـــــ

"گھریلو جھنجھٹ کیسا بھلا ؟ شادی بیاہ کیا ہے ؟"

"نہیں ، نہیں ۔شادی تو نہیں کی ، کھیتی باڑی کا جھنجھٹ ۔اب تو کھیتی میں لگے رہنے والے لوگ ہی نہیں رہ گئے ۔ بڑے بھیا تو شادی کر کے الگ ہو گئے ۔"

دونوں میں اور بھی کچھ باتیں ہوئیں ۔ ملٹری کے کام کے بارے میں باکھر نے کہا۔

"پتاجی تقریباً" آٹھ بجے ایک بار ناشتہ کرنے آئیں گے۔ تم کہہ دینا۔ صاحب سے کہہ کر کوئی کام دھام دلوا بھی سکتے ہیں ۔آدمی تو لیے جا رہے ہیں ۔"

شاکیہ آئے ۔گرین کے ساتھ گھریلو باتیں کیں ۔ باکھر نے اس کے کام کی تلاش کے متعلق پتاجی کو بتایا ۔شاکیہ نے کچھ سوچ کر کہا ـــــ

"ٹھیک ہے ، دیکھا جائے گا ، کیا کر سکتے ہو۔ تم شام کو ایک بار آفس میں آ جانا ۔ اپنے بڑے صاحب سے میں کہہ دیکھوں گا ۔"

شاکیہ آفس چلے گئے ۔ باکھر نے بھی نہا دھو کر گرین کے ساتھ کھانا کھایا اور اسکول چلا گیا ۔

بھیم چندر کو کھانا بناتے ، پروستے دیکھ کر گرین کے پیٹ کی آنتیں کلبلانے لگیں ۔رام ، رام ! بھلا قلی کے ہاتھوں سے بھی کھانا پکوا کر کھایا جا سکتا ہے ؟ مگر ۔ 'چھی چھی ' کو زبردستی پرے دھکیل کر وہ اس طرح کھانے پر مجبور ہو گیا جیسے خوشی خوشی ہی کھا رہا ہو۔کیوں کہ ذات بھلے ہی جائے ، مقصد براری تو کرنی ہے ۔

پھر بھی بچوں کا پیٹ نہیں بھر پایا۔ایک بار میں سیر بھر چاول کا بھات اڑا جانیوالے اس آدمی سے پاؤ بھر چاول کا بھات بھی نہیں کھایا جا سکا ۔ باکھر کے اسکول جانے کے بعد گھومنے کے بہانے اسٹیشن کے پاس کی ایک چائے کی دکان میں جا کر چائے ناشتہ کرنے کے بعد ہی اسے چین آیا ۔ وہ اندازہ ہی نہیں کر سکا کہ دکاندار کا

ٹھلوا لڑکا بھی بھیم ہی کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔

باکھر پیدل ہی اسکول روانہ ہوا تھا۔ سائیکل رات کو پنکچر ہوگئی تھی۔ روانہ ہوتے وقت ہی نظر پڑی۔ مرمت کی ذمہ داری بھیم پر ڈال کر وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا چل پڑا۔
ملٹری کی گاڑیوں کی وجہ سے تیز قدم بڑھانا بھی مشکل تھا۔ دو قدم آگے چلنے پر کوئی نہ کوئی ٹھری وھیلر یا جیپ نکل آتی۔ جھنڈ کے جھنڈ چلے آرہے تھے۔ انگریزی فلموں میں جیسے کبھی کبھی کوئی عجیب وغریب جاندار سامنے آجاتا ہے ویسے ہی پیچھے سے اچانک کوئی بھیانک کرین والی گاڑی کر یہہ شور کرتی ہوئی نکل آتی غیر فوجی سواریوں کا تو کوئی نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ سڑکیں تو جیسے ملٹری کی آسانی کے لئے ہی نئے ڈھنگ سے بنائی گئی ہیں۔
ڈمڈما کے بازار بھی سپاہیوں کے لیے ہی جدید ڈھنگ سے نئی نئی چیزیں لاکر سجائے گئے تھے۔ عام لوگوں کی روزمرّہ زندگی میں تو ان چیزوں کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوکان میں اتنی تعداد میں سنگھار کے ڈبے لوگوں نے اس سے قبل پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ رنگ برنگے چاکلیٹ طرح طرح کے رائیٹنگ پیڈ اور سیاہی کی بوتلیں نئی نئی سی لگتیں۔ رباب لیموں کا دکان پر بکنا اور ناریل کاٹ کر بیچنا بھی شاید یہاں پہلی بار شروع ہوا تھا۔
گاڑیوں کے ساتھ جیسے لوگوں کے قدم بھی تیز تیز پڑنے لگے۔ پہلے تو اتوار کو بازار لگنے اور کبھی کبھی اچھے فٹ بال میچ ہونے پر ہی اس خاموش شہر میں کچھ چہل پہل ہوتی تھی۔ اب تو آبادی اچانک اتنی بڑھ گئی ہے کہ پہلے کی بات کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ موٹے مسٹنڈے، کالے اور گورے سپاہی، ڈھیلی ڈھالی 'آل کور' پوشاکیں اور اٹھا نہ سکنے کے باعث گھسٹ کر چلنے والے بھاری بوٹ پہنے دبلے پتلے ہندوستانی سپاہی اور ناٹے قد کے پیلے چہرے والے، ننھی ننھی آنکھیں، کان، ناک والے چینی لڑاکے ہی اکثر دکھائی پڑتے ہیں۔
ان سب کے درمیان سے باکھر آگے بڑھتا جارہا تھا۔ کسی نے اسے پیچھے سے پکارا!
"ہیئی جو۔ ہیئی" یعنی ارے او بھائی۔
لڑائی کے زمانے میں سپاہیوں کا راج ہوتا ہے۔ اس لیے اچھے برتاؤ کی امید

کم ہی ہوتی ہے۔ باکھر نے مڑکر دیکھا۔ چند قدم پیچھے دو امریکی سپاہی جس میں ایک افسر جیسا لگتا تھا، چلے آرہے تھے۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر چلتا رہا۔ بازار کے درمیان سے ہوکر وہ اسکول کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔

" ہیئی، جو ہیئی" سپاہی نے پھر آواز دی۔

باکھر نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ سپاہی کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کندھا پکڑ لیا۔ باکھر رک گیا۔ سپاہی بولا ـــــ

"تم کیسے آدمی ہو جی۔ اتنا بلا رہا ہوں جواب ہی نہیں دیتے؟"

تیسرے درجے سے ہی پڑھی ہوئی انگریزی زبان بھی پہلے اچھی طرح نہ سمجھ کر باکھر کو حیرت ہوئی۔ چند لمحے خاموش رہ کر سوچنے کے بعد ہی وہ سمجھ پایا تھا۔ اسے یہ سوچ کر ہنسی آنے لگی تھی کہ اس نے اب تک انگریزی پڑھی ہی تھی سنی نہیں تھی۔ آج ہی وہ سن پایا ہے۔

اس دوران افسر بھی آگیا۔ باکھر نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک نوجوان تھا۔ باکھر کی ہی عمر کا رہا ہوگا۔ چہرے پر معصومیت۔ بڑی بڑی گہری نیلی آنکھیں۔ بدن مضبوط، تندرست اور گٹھا ہوا۔ ایسے معقول آدمی کا برتاؤ اتنا نامعقول کیوں؟

سپاہی نے اب بھی اس کے کندھے پر اپنی گرفت مضبوط کر رکھی تھی۔ اس نے اسے گھورتے ہوئے صاف انگریزی میں کہا ـــــ

" آپ کو بھلا میرے جسم کو اس طرح گرفت میں لینے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

افسر فوراً بولا ـــــ

"جیمی۔ جیمی۔ چھ۔۔۔ چھوڑ دو ـــ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"یس لیفٹیننٹ" ! جیمی نے باکھر کو اسطرح چھوڑ دیا جیسے انجانے میں کسی بڑی غلطی کا مرتکب ہوا ہو۔

باکھر نے پوچھا ـــــ

"آپ لوگوں کو کیا چاہیے؟"

افسر نے کہا ـــــ

" معاف کریں۔ ہم دراصل آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتے تھے۔"

" اچھی بات ہے، کھل کر پوچھیے۔ لیکن کسی شریف آدمی سے ایسا برتاؤ کرنے کے

بعد مدد کی کیا امید کی جاسکتی ہے ؟"

افسر خفیف ہوگیا۔ سر نیچا کر کے نہایت ملائمت سے بولا ——

" جناب ! جیمی کے برتاؤ سے مجھے بہت افسوس ہوا ہے ۔اس کی طرف سے میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں "

" چلیے ، آگے چلیں "۔ آگے قدم بڑھاتا ہوا باکھر بولا —"کہیے آپ کیا کہنا چاہتے تھے ؟"

"کوئی خاص بات نہیں "۔ افسر نے کہا —" میں دراصل اس ملک کے متعلق جانکاری حاصل کرنے کے لیے کچھ کتابوں اور رسائل کے بارے میں جاننا چاہتا تھا"

باکھر خاموش ہوکر سوچ رہا تھا —— افسر بات چیت سے تو معقول معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا برتاؤ اس نے کیوں کیا یا کرنے ہی کیوں دیا ؟ کسی ملک کے بارے میں جاننے کے لیے جو کتابیں تلاش کر رہا ہو کیا وہ نامعقول ہوسکتا ہے ؟

شاید اس کے احساسات کو سمجھ کر ہی افسر بولا ——

" آپ شاید جیمی کے برتاؤ کے متعلق سوچ رہے ہیں ۔ مجھے سچ مچ بہت برا لگا ۔ آپ یقین کیجیے ، میں بے حد شرمندگی محسوس کر رہا ہوں کہ جیمی سپاہی کی غیر ذمہ دارانہ عادت کو نہیں روک سکا۔ میں بھی اس کی مدد لینے پر مجبور اس لیے ہوں کہ وہ مجھ سے کافی پہلے سے یہاں آیا ہے "

باکھر نے پوچھا ——

" تو آپ یہاں نئے نئے آئے ہیں ؟

" جی ہاں ، ابھی پرسوں ہی آیا ہوں "

کچھ لمحے چپ رہ کر باکھر بولا ——

" ٹھیک ہے ، آپ اگر میرے ساتھ چل سکیں تو میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں "

" شکریہ ! "

جیمی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔

مغربی سرے سے پانچ منٹ دھیرے دھیرے پیدل چلنے پر ہی نہر کے اس کنارے تک پہنچا جاسکتا ہے ۔ ڈمڈما کا مڈل اسکول بھی وہیں ہے ۔اسکول میں جانے کی راہ پکڑ کر باکھر نے پوچھا ——

"کیا آپ ہمارے ملک کے متعلق جاننے کے سلسلے میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں ؟"

"ویسے مجھے زیادہ معلومات تو نہیں ہیں - امریکہ میں مختلف ممالک کے بارے میں یونی ورسٹی میں پڑھا کرتا تھا - اسی لیے کسی بھی سماج کے بارے میں جاننا میں پسند کرتا ہوں - ایسی بات نہیں ہے کہ ہندوستان کے متعلق میں نے کچھ پڑھا نہیں ہے لیکن مقامی طرزِ زندگی کے بارے میں اگر کوئی کتاب ہو تو میں اسے پڑھنا چاہتا ہوں - دوسرے ملک میں جاکر وہاں سے تھوڑی بہت جان کاری لے کر نہ جائیں تو لوگ ہمیں کیا کہیں گے؟"

"ہاں یہ تو فطری بات ہے" باکھر نے کہا -

تینوں اسکول پہنچے - باکھر نے انہیں چھوٹی سی لائبریری میں لے جاکر بٹھایا - اسکول کے لڑکے لڑکیاں ان امریکی سپاہیوں کو بہت حیرت سے دیکھ رہے تھے - دو ایک لڑکے چھپ کر ہنسی بھی اڑا رہے تھے لیکن ہیڈ ماسٹر کے سامنے نکل کر شرارت کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی -

کتاب تلاش کرتے ہوئے باکھر بولا ——

"اپنے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے میں ایک مثال دینا چاہتا ہوں"

"جی ہاں فرمایے"

"ہمارے اسکول کی ظاہری شکل و شباہت تو آپ نے دیکھ ہی لی"

"جی ہاں!"

"اب اپنے یہاں کے اسکول سے اس کا موازنہ کیجیے - ہمارا ملک بھی ایسا ہی ہے"

افسر بولا ——

"میں شاید سمجھ نہیں سکا"

"اس میں کوئی راز تو نہیں ہے - میری بات کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اسکول کی حالت دگرگوں ہے"

"لیکن لگتا ہے کہ اس ملک کے لوگوں کی ذہنی حالت دگرگوں نہیں ہے"

"ہم امید پر جینے والے جو ٹھہرے"

پھر باکھر تین کتابیں نکال کر دیتے ہوئے بولا ——

"مجھے امید ہے ان سے آپ کو کچھ مدد مل سکے گی"

"شکریہ"! افسر بڑی ممنونیت سے کتابیں کھول کر دیکھنے لگا - جیمس بھی ایک کتاب کھول کر نظر دوڑانے لگا - افسر کو اتنی شرافت سے باتیں

کرتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا تھا اور کتاب کو ہاتھ میں لے کر بالکل بے وقوفوں کے سے انداز میں کبھی کتاب اور کبھی باکھر کے چہرے کا جائزہ لینے لگتا تھا۔

افسر نے کہا ـــــ

"کیا میں یہ کتابیں لے جا سکتا ہوں؟"

"جی ہاں!"

"کتنے دن رکھ سکوں گا؟ سمجھ کر پڑھنے میں کچھ وقت بھی تو صرف ہو گا نا۔"

"یہ میری ذاتی ملکیت ہیں۔ میں آپکو تحفتاً دے رہا ہوں۔ براہِ کرم انہیں قبول کریں۔"

"تھینکس اے لوٹ، تھینکس اے لوٹ!"

جانے کے لیے کھڑے ہو کر افسر نے کہا ـــــ

"آج مجھے آپ سے کافی مدد ملی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کبھی کبھی آپ کے پاس آجایا کروں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"بالکل نہیں۔ اسکول میں آئیں تو ہیڈ ماسٹر کے متعلق دریافت کرلیں۔ مجھ سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ"!

جیمی نے کھڑے ہو کر نہایت ملائمت سے کہا ـــــ

"جناب انجانے میں جو سلوک میں نے آپ سے کیا اس کے لیے میں بہت ہی شرمندہ ہوں۔ براہِ کرم اپنا ہاتھ بڑھائیں۔"

"ضرور، ضرور"! باکھر نے داہنا ہاتھ آگے بڑھا کر ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ کے تئیں کوئی برا خیال میرے ذہن میں نہیں ہے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں!

دونوں نے ہاتھ ملائے۔ افسر نے بھی مصافحہ کر کے رخصت لی۔

باکھر اسکول کی حالت دیکھ کر بہت فکر مند ہو گیا۔ دن بدن طلبا کی تعداد گھٹتی ہی جا رہی تھی۔ جنگ کی ہلچل کے باعث ہی والدین بچوں کو گاؤں یا کسی محفوظ مقام پر پہنچا آئے ہیں۔ نوکری سلامت رکھنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر خود یہیں رہ گئے۔

باکھر نے چھٹی کلاس میں جا کر ایک طالب علم سے پوچھا ـــــ

"گجین، تمہارے ساتھ کے وہ دونوں، بین اور وکاس کہاں گئے؟"

طالب علم نے جواب دیا ـــــ

"وہ شیو ساگر چلے گئے ہیں سر!"

"کیوں"؟

"جنگ کی وجہ سے سر۔ ان کے پتا جی، ان کی ماں اور دوسروں کو لے جاکر گاؤں پہنچا آئے ہیں۔"

"ہوں" کہہ کر باکھر نے ایک اور لڑکے سے پوچھا ـــ "منگل بودھن کہاں ہے؟"

منگل چائے مزدور کا لڑکا ہے۔ کہا ـــ

"سنتے ہیں اب وہ نہیں پڑھے گا۔"

"کیوں؟"

"سنا ہے وہ ملٹری میں کام کرے گا۔ فیلڈ میں۔"

"ان کے پتا نے جانے دیا؟"

"کچھ بھی نہیں کہا سر۔"

باکھر کو یاد آیا۔ بودھن کا باپ جو چوکیدار ہے، اسے پڑھائی لکھائی سے گہری دلچسپی تھی اور اسی باعث بیٹے کو ماسٹر کے ہاتھوں میں سونپ گیا تھا اور لڑکے کی تعلیم کے متعلق معلومات حاصل کرنے مہینے میں دو بار آیا کرتا تھا۔

اسے بہت افسوس ہوا۔ بودھن پڑھنے لکھنے میں بھی برا لڑکا نہیں تھا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی باکھر نے دیکھا گرین ہنستا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پوچھا ـــ "کیا ہوا"؟

"میں شام کی گاڑی سے گھر جا رہا ہوں بھیا جی!"

"مطلب؟" باکھر حیرت زدہ ہوا۔

"خیر جان چائے بگان میں مزدوروں کی نگرانی کا کام مجھے مل گیا ہے۔ ابھی ابھی بڑے صاحب سے مل کر آ رہا ہوں۔ چوتھے دن سے مجھے ڈیوٹی جوائن کرنا پڑے گی۔"

کرسی پر بیٹھ کر باکھر بولا ـــ

"واہ! تمہاری تقدیر زوردار ہے۔ آج ہی آئے اور کام بھی مل گیا۔"

گرین شرما کر بولا ـــ

"آپ بھی کیا کہتے ہیں بھیا جی۔ موسا جی نے کہہ سن کر دلوا دیا ورنہ کون پوچھتا!"

"مزدوروں کے کام کی نگرانی کیسے کی جاتی ہے، کیا تمہیں معلوم ہے؟"

"ہیں، یہ سب جانتا ہوں نا" اپنی صلاحیت کے بارے میں گرین کو ذرا بھی شک نہ تھا۔ "میں نے اپنے گاؤں کے پاس کے اس نیٹیو گارڈن (ہندوستانی ملکیت کے چائے بگان) میں چھ مہینے میں کام سیکھا تھا نا۔ کام نہ ملنے کی وجہ سے ہی تو چھوڑ دیا ہے۔"

باکھر بولا ــــــ

"سچ؟ تب تو ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔"

چائے ناشتہ لاکر دیتے ہوئے بھیم نے مطلع کیا کہ وہ آج رات کو لائن میں جانے والا ہے۔ کیوں کہ اب لائن میں پہرہ دینا ضروری ہوگیا ہے۔ گرین کی گاڑی سات بجے ہے۔ کھانا کھا کر جانا ہے اسلیے اس نے ایک ہی بار میں کھانا تیار کرلیا ہے۔ وہ بولا ــ

"تم اور پتاجی کھانا نکال کر کھا لینا۔"

کھانا کھا کر گرین چلا گیا۔ باکھر کو ایک بار پھر کھانے کی یاد دہانی کرکے بھیم بھی شام کا دھندلکا ہوتے ہی لائن میں چلا گیا۔

گھر کے اندھیرے میں باکھر خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ ساری دنیا انتشار کا شکار ہو چکی ہے، سب کچھ منتشر ہو چکا ہے۔ صرف وہی بے حس پتھر بنا ہوا ہے۔

دریودھن، منی اور گوری کے بارے میں سوچتا ہوا بھیم لائن کے اندھیرے میں گم ہوتا جا رہا تھا۔

دریودھن اس کا جگری دوست ہے۔ ماضی میں بھیم اور دریودھن ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ لیکن اب وہ جگری دوست بن گئے ہیں۔ وقت پر دونوں ایک ساتھ رہا کرتے ہیں۔ سینما تھیٹر دیکھنے بھی دونوں ساتھ ہی جاتے ہیں۔

اس تبدیلی کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے اہم ہے گوری۔ وہ دریودھن کی کوئی رشتے دار ہے اور دریودھن کی بہن منی گوری کی سہیلی ہے۔ گوری کے ساتھ تعلقات بھی منی کے ہی توسط سے ہوئے ہیں۔ اس نے بھیم کے دیے ہوئے تحائف گوری تک پہنچا کر ان کو قریب کر دیا ہے۔ گوری جب منی کے یہاں آتی ہے تو وہاں بھیم بھی پہنچ ہے اور آج کل گوری لگاتار ان کے یہاں آنے لگی ہے۔ یہ بات بھی دریودھن کی نظر میں ہے

دریودھن نے بھیم کو گوری سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے تعلقات میں اور بھی گہرائی پیدا ہوگی۔ ماضی کے دریودھن کی طرح اب وہ بد دماغ اور خوش فہم نہیں تھا۔ بھیم تو خیر چھریرے بدن والا نوجوان ہے۔

بھیم جیسے ہی لائن کے نزدیک پہنچا، شور و غل کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں۔ "مارو۔ مارو، پکڑو۔ پکڑو" ایک شور برپا ہے۔ لوگ دوڑ رہے ہیں اور کوئی عورت برابر چیخے جا رہی ہے۔ قریب سے گزرتے ہوئے ایک آدمی سے بھیم نے پوچھا ——

"کیا ہوا ہے"؟

وہ آدمی پھولی ہوئی آواز میں بولا ——

"دو گورے سپاہی لائن میں گھسنا چاہتے تھے۔ لائن کے لوگ انھیں مارنے کے لیے دوڑ گئے ہیں۔"

بھیم تیزی سے جائے وقوع کی جانب بڑھا۔ کچھ آگے بڑھتے ہی دریودھن مل گیا۔ ہاتھ میں مچھلی مارنے کا بھالا لیے چلا آرہا تھا۔ بھیم بولا ——

"ارے باپ رے! دریودھن آدمی مار آیا کیا؟"

"نہیں سالا بھاگ نکلا۔" دریودھن بولا —— "نہیں تو مزا چکھا دیتا۔"

"دھت —— تو کیا آدمی کو مارے گا"؟

"ارے بچو ہاتھ نہیں آئے ورنہ بتا دیتا۔"

کچھ لمحے چپ رہنے کے بعد بھیم نے دھیرے سے پوچھا ——

"دریودھن، گوری ہے کیا تیرے یہاں"؟

دریودھن نے ہنستے ہوئے کہا ——

'بدمعاش —— نہیں ہے۔

اس بستی میں دو رویہ اونچی اونچی بلڈنگیں کھڑی ہوئی ہیں۔ انہیں کئی کئی حلقوں میں تقسیم کرکے مزدوروں کو رہنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اسی لائن کے ایک سرے پر دریودھن کا گھر ہے۔ گھر کیا ہے بس دو کمرے ہیں اور سامنے ایک برآمدہ

بھیم کو آنگن میں اسٹول پر بٹھا کر وہ اندر چلا گیا ۔ دریودھن کا باپ منگرا اندر سے نکل کر آیا اور بھیم کو مخاطب کرتا ہوا باہر چلا گیا ۔ منی نے آکر پوچھا ——
کے لاگس ، دادا ؟ یعنی کون ، بھیا ہے کیا ؟
بھیم بولا ——
" ہاں منی ، میں ہی ہوں ۔ کیا کھانا کھا چکی" ؟
" نہیں ابھی کھانا کہاں کھایا ۔ ابھی تو چڑھایا ہی ہے" منی بولی ——
" چاول ہی دھو رہی تھی تبھی گورے سپاہی کا جھگڑا کھڑا ہو گیا ۔ سن کر اور پھر کہنا کیا ہے ؟ سالے ایسے بدمعاش ہیں" ۔
" ہوں بھائی ۔ ان کے مارے تو لائن میں رہنا ہی مشکل ہو گیا ہے" بھیم نے اتنی تمہید باندھنے کے بعد اصل بات کی جانب رخ کیا ۔ مدھم آواز میں سرگوشی کی ۔
" منی ، تم لوگوں کے یہاں وہ آئی تھی کیا" ؟
" کون" ؟ منی بالکل انجان سی بن گئی ۔
" گوری" !
منی بناوٹی غصہ دکھا کر بولی ——
" جا تجھے تو بس ہر وقت گوری کی ہی فکر لگی رہتی ہے" ۔
" بتا نا ۔ بتا دے" ۔
" میں گوری سوری کی بات کیا جانوں" منی نے معنی خیز انداز میں کہا ۔
بھیم کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ تبھی دریودھن نکل آیا ۔ بات ختم ہو گئی ۔ دریودھن بولا ——
" منی بھیم بھی یہیں کھانا کھائے گا ۔ تو رسوئی بنا ۔ میں ایک مرغی لے آؤں ۔ شاید کاکا کے یہاں مل جائے ۔ بھیم ذرا تو بیٹھ" ۔
دریودھن نکل گیا ۔
بھیم نے پھر خوشامد شروع کر دی ——
" بتا نا میری اچھی منی !"
" ارے میں کیا بتاؤں" ؟
" زیادہ شور مت مچا ۔ ماں سن لیں گی" اندر منی کی بیمار ماں سوئی ہوئی تھی ۔

نہ دیکھنے کے باوجود بھی ایک بار نظر ڈال کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا___
"گوری آئی تھی کیا ؟ بتا نا منی"۔
"نہیں ۔ نہیں آئی تھی"۔
"آئے گی کیا"؟
"مجھے کیا معلوم"!
"تجھے نہیں معلوم تو پھر کسے معلوم ہے"؟ بھیم نے پھر خوشامد شروع کر دی ۔
"تم دونوں کی دوستی خیر جان بگان میں کون نہیں جانتا۔تم دونوں جیسی دوستی بھلا دنیا میں کسی کی ہے"؟

" اونہہ باتوں کے کھلونے بنانا خوب سیکھ گئے ہو ۔خوب چکنی چپڑی باتیں کر لیتے ہو۔کہاں سے سیکھا ہے یہ سب کچھ"؟

بھیم چپ رہا۔

بیمار ماں اندر اکیلی ہے ، یہ خیال آتے ہی منی اٹھ کھڑی ہوئی ۔چولہے پر چڑھا بھات بھی اسے دیکھنا ہے ۔لیکن بھیم کو نظر انداز کر کے جانا بھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اندر جانے سے قبل اس نے کہا___

" بھیا کاکا کے یہاں گئے ہیں مرغی لانے ۔ تم نے نہیں دیکھا ؟ تم بھولا ناتھ شاید گوری کی راہ تک رہے ہو"۔

کاکا یعنی وکل کسی رشتے سے دریودھن کا کاکا لگتا ہے ۔گوری وکل کی ہی بیٹی ہے___

باہر بیٹھے بیٹھے بھیم سوچنے لگا___ کس طرح سے منی کو راہ راست پر لایا جائے ۔اگر گوری دریودھن کے ساتھ نہیں آئی تو کیا منی جا کر اسے اپنے ہمراہ لے آئے گی ؟

منی نے پھر باہر آکر بھیم کو ایک نال مول (پان سپاری) دیا ۔ خود بھی ایک کھایا ۔بھیم نے کہا___

" منی تو ذرا گوری کو بلا کر لا سکتی ہے ۔ تجھے جو کچھ بھی چاہیے ، میں اس بار تنخواہ ملتے ہی بازار سے خرید کر لادوں گا"۔ پچھلے پکھواڑے میں گوری کو تحفہ دینے کی وجہ

سے وہ منی کو ایک گز کپڑا لاکر دینے کا وعدہ بھی پورا نہیں کر پایا تھا۔
اس نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا ——
"تو بہت پاجی ہو گیا ہے دادا۔"
تبھی ہاتھوں میں ایک مرغی دبائے دریودھن آپہنچا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک لڑکی تھی۔ اس نے کہا ——
"بھیم ہے نا؟ منی میں مرغی بناؤں تو سب ٹھیک رکھنا۔"
برآمدے کے ایک کونے میں جاکر وہ مرغی بنانے لگا۔ لڑکی اندھیرے میں کچھ ہٹ کر کھڑی ہوئی تھی منی بولی ——
"وہ گوری آ گئی، لے اب۔"
"چل ہٹ شریر!" کہہ کر لڑکی مصنوعی غصّے کا مظاہرہ کرتی آگے بڑھی اور منی کے بال پکڑ لیے۔
"ارے چھوڑ، چھوڑ۔" منی نے کھلے بالوں کو اس کے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا —— "تیرے بغیر دادا مجھے پریشان کرتا رہتا ہے گوری۔ ہر دم بس تیرا نام جپتا رہتا ہے کبھی تم دونوں اب بات کرو میں بھات چڑھا کر آتی ہوں۔"
وہ جانے لگی۔ گوری کو بھی پیچھے پیچھے آتا دیکھ کر وہ پیڑھے پر بیٹھ گئی اور کہا۔
"یہاں آکر بیٹھ۔ آج اتنی شرم کیوں؟"
گوری اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ بھیم نے پوچھا ——
"منی تیرے بابا کسی طرف نکل گئے ہیں کیا؟"
"تو کیسا پریمی ہے دادا۔ دنیا میں تجھے اور کوئی بات کرنے کو نہیں ملی؟"
وہ جانتی تھی کہ اس کے باپ کو نکل کر جاتے ہوئے بھیم نے دیکھا ہے۔
بھیم نے کہا ——
"تو بہت نٹ کھٹ ہو گئی ہے ری۔"
کاٹ کر بنائی ہوئی مرغی لیے دریودھن آگیا۔ اس نے بہن سے کہا ——
"منی تو جھٹ پٹ سارا کام کر ڈال۔ رات ہوتی جارہی ہے۔ میں ذرا جاکر دیکھ آؤں بڈھا کہاں پڑا ہے۔ ضرور کہیں دارو چڑھا رہا ہوگا۔"

دروازے کے پاس مرغی رکھ کر وہ بڑی عجلت میں لائن کے اندر چلا گیا۔ پھر وہ باہر نہیں نکلا۔

حالاں کہ اس بار گوری اٹھی نہیں تھی۔

گوری کی اب کچھ ہمت بندھ گئی ——
"ہاں، پیار کیا تو ڈرنا کیا۔"
کچھ لمحے دونوں خاموش رہے۔ پوری بستی کی مصروفیت ایک غیر محسوس گنگناہٹ سی معلوم ہو رہی تھی۔ رات کے اندھیرے کو وہ اور زیادہ ہی خاموش بنا دیتی ہے۔
بھیم نے آہستہ سے آواز دی ——
"گوری!"
لیکن گوری خاموش رہی۔
اس نے پھر پکارا ——
"گوری بولتی کیوں نہیں؟"
"جی!" اس نے دبی آواز میں کہا۔
بھیم کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا ——
"تیرے ماں باپ کیا ساری باتیں جان گئے ہیں"؟
وہی خاموشی۔
"گوری"!
"نہیں جانتے۔"
"تو مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے؟'
"نہیں۔"
اس نے بے باک ہو کر کہا ——
"ٹھیک ہے۔ میں ان سے کہہ دوں گا۔ مجھ سے شادی کرنے پر تو رضا مند ہے نا"؟
منہ سے ایک مخصوص آواز پیدا کر کے اس نے اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا
بھیم نے عاشق کی سی اداکاری کرتے ہوئے کہا ——

"میں تو تیرے لیے پاگل ہو رہا ہوں گوری۔ سچ کہتا ہوں آج کل گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ صرف لائن میں آنے کی خواہش ہوتی ہے۔ تجھے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔"

بس ایک گہرا سناٹا۔

حالانکہ لائن میں بہت سے آدمی ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باہر ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ منی کا گھر لائن کے ایک گوشے میں ہونے پر لوگوں کا آنا جانا بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ اندھیرا، خاموشی اور دو جوان جسموں کی موجودگی نے جیسے دونوں کے جسم میں آگ لگا دی۔

بھیم گوری کے پاس جا بیٹھا۔

اندر منی گوشت پکا رہی ہے۔ وہ جلدی آئے گی نہیں۔ بیمار ماں تو بستر سے اٹھتی ہی نہیں۔ بوڑھا منگرا کہیں 'لاؤ پانی' (چاول کی شراب) پی کر بدمست ہو رہا ہوگا۔ باپ کو تلاش کرنے کے بہانے دریودھن بھی کہیں چلا گیا ہے۔ وہ بھی جلد واپس نہیں آئے گا۔

بھیم اٹھ کر گوری کے پاس بیٹھ گیا۔ امنڈتی جوانی اور نرم و نازک بدن کو اس نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ معمولی سی مزاحمت کرنے کے بعد گوری خاموش ہو رہی۔ اس نے اپنے جوان جسم کو بھیم کے حوالے کر دیا۔ اس پر خودسپردگی کی کیفیت طاری تھی۔ شعوری احساس کے تحت ان کے بدن کانپ اٹھتے جیسے اندھے ہو جانا چاہتے ہوں۔ لیکن وہ دونوں بے حس نہیں ہوتے۔ دونوں کے شعور میں منی، ماں، دریودھن، لائن، راہ گیر سب باری باری آتے رہے۔ یہ سچ ہے کہ محبت میں ڈر نہیں لیکن غیر اخلاقی محبت میں تو ڈر ہے۔

دونوں اندر ہی اندر کانپ اٹھے۔

"بھیم رے!" دور سے دریودھن کی چیخ سنائی دی۔

بھیم چونک اٹھا۔ وہ فوراً گوری سے الگ ہو کر اسٹول پر آ بیٹھا۔ اس وقت وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ جسم کے اندر ایسی گرمی کا احساس اس نے اس سے قبل کبھی نہیں کیا تھا۔

'بھیم'! دریودھن پھر چیخا۔
'کیا'؟ بھیم نے بھی چیخ کر جواب دیا۔
" ادھر آ جانا جلدی"!
" ٹھہر"۔
بھیم نے گوری کے پاس جاکر کہا ——
"گوری، تو اندر جا تو"! کہہ کر اس نے اس کے ایک رخسار پر زور سے چٹکی کاٹ لی۔
دریودھن برابر چیخ رہا تھا وہ اسی طرف بڑھ گیا۔ گوری منی کے پاس جاکر بیٹھ گئی جواب تک گوشت پکا رہی تھی۔ مرغی کے ٹکڑے کو کاٹنے کے لیے چھری اٹھاتے ہوئے وہ ہنس پڑی۔
بھیم نے دریودھن کے پاس جاکر پوچھا ——
" کیوں دریودھن! کیا بات ہے؟"
دریودھن نے شرارت آمیز لہجے میں پوچھا ——
" ہوگیا کیا؟"
"کیا؟"
" پریم"۔
دھت"!
" سالا دھت کہتا ہے۔ چل اپنے بوڑھے کو لے آئیں۔ رام داس کے یہاں پی کر بالکل دھت پڑا ہے"!
دونوں آگے بڑھ گئے۔

عظیم الشان مکانوں کے پارٹیشن کیے ہوئے ایک ایک کمرے میں ایک مزدور خاندان رہتا ہے۔ ہر گھر کے سامنے ایک چھت ڈال کر اسے بڑھا لیا گیا ہے ورنہ کمپنی کے بنائے ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں بال بچوں سمیت رہنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مستطیل مکانوں کے برابر بہتا ہوا پکا نالا اور اس سے ملا کر بانس کی ٹٹیوں سے گھیر کر مزدوروں نے آنگن بنا لیا ہے۔ ہر خاندان کے

نہانے اور برتن مانجھنے کی جگہ ایک کونے میں ہے ۔کسی کے یہاں نیم کا پیڑ، کسی کے یہاں پیپتے کا پیڑ اور کسی کے یہاں پیڑ پودے کچھ نہیں۔

بستی کے قطاروں والے گھروں میں اس وقت طرح طرح کی مصروفیات تھیں کوئی بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ کہیں کچھ لوگ تاش یا جوا کھیل رہے تھے ۔عورتیں کھانا پکا رہی تھیں۔ کہیں جھگڑے اور بحث مباحثے بھی ہو رہے تھے ۔ایک دو جگہ چند آدمی بیٹھے تکرار کر رہے تھے۔ ہانڈیا (چاول کی شراب) اور کاغذیہ (جھگڑا) انھیں دونوں باتوں کی موجودگی زیادہ تھی ۔ایک گھر کے اندر ایک لڑکا چیخ چیخ کر آسامی پڑھ رہا تھا۔

گنگے دیو، اسہنی، گام کھارو ، اول گنی ——

(گنگے جی ، اسہن، ہاتھ کا کڑا ،سواگت)

انہیں کے بیچ بھیم دریودھن پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ۔اسی وجہ سے وہ ان باتوں کے عادی ہو چکے ہیں ۔ وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے ۔

بستی کے درمیان کے ایک مکان کے سامنے وہ رک گئے ۔ گھر کے اندر ڈھول بج رہا تھا اور کوئی شرابی جسے چڑھ گئی تھی چیخ چیخ کر گا رہا تھا۔

'ای را

بانٹی لو چا گھر

چھورار پا تا مارا کام دنے رائتے :

یعنی انگریز بہت عقلمند ہیں جنہوں نے چائے گھر (چائے کارخانے) جیسے بڑے بڑے مکان بنوائے ہیں اور قلی اتنے کمزور ہیں کہ انہیں دن رات صرف پتیاں توڑنے ،پیسنے کے کام چائے گھروں میں کرنے پڑتے ہیں ۔

ڈھول کی تال اور دھن سنگت کے درمیان کوئی راگ الاپتا تھا —— او —— ہو —— ہو —— آہ —— آہ ۔ یہ اڈہ کافی لوگوں کا ہے اس میں کوئی شک نہیں ۔ دریودھن نے اندر جا کر شراب کے نشے میں دھت منگرا کو پکڑ کر کہا ——

"اٹھو، اٹھو، گھر چلیں"

بوڑھا منگرا چونک کر لڑکھڑاتی زبان میں بولا ——

"ارے ۔ بھاگو یہاں سے ! ہام نائی جائے گا۔ تم کن ہائے ۔ چھوڑ دو ہام کو"

پاس کے ایک شرابی نے پہچانتے ہوئے کہا ــــــ
"ارے چاچا منگرا، تیرا بیٹا آیا ہے۔ یودھن آیا ہے تجھے گھر لے جانے کے لیے۔ جا"۔
منگرا کو جیسے تبھی ہوش آ گیا۔ بولا ــــــ
"او باپ یودھن! چل باپ چل!! پکڑ مجھے پکڑ۔ نہیں تو میں چل نہیں سکوں گا نا۔ پکڑ! اے سالا رام داس۔ میں چلا گھر۔ میرے بیٹے کا کام دیکھا؟ باپ کو لے جانے کے لیے آیا ہے۔ دیکھ!"
دریودھن تب تک باپ کو سنبھالتا ہوا باہر لے آیا۔ بھیم کے ساتھ منگرا کو پکڑ کر اس ڈھنگ سے چل رہا تھا جیسے اسے ڈھو رہا ہو۔ منگرا نے پکارا ــــــ
"یہ کون بیٹا مجھے پکڑ رہا ہے"؟
"بھیم ہے"۔ دریودھن نے بتایا
"بھیم، شاید تو بڑے کرانی بابو کے گھر سے بھاگ کر گوری کو دیکھنے آیا ہے۔ سالا، چالاک، بے ایمان کہیں کا"۔
بوڑھے کی زبان سے اس وقت نکلی ہوئی ان بھدی گالیوں کو سن کر شرم کے مارے دونوں نے سر جھکا لیا۔ منگرا نے پھر کہا ــــــ
"اچھا اس بڈھے کو یاد لابنا دیکھ کر تو پکڑ لے جانے آیا ہے۔ بڑا اچھا کام کیا ہے۔ بڑا اچھا کام کیا ہے۔ تو بڑا بھلا لڑکا ہے۔ ٹھیک ہے بیٹے میں تیری شادی کروا دوں گا۔ تو نہ ڈرنا۔ بکل کی بیٹی ہے نا۔ ارے بکل تو میرا بھائی ٹھہرا! بکل کی بیٹی میری بھی بیٹی ہے۔ تو ذرا بھی پرواہ نہ کرنا"
نشے میں دھت منگرا کو ان دونوں نے اندر لے جا کر کھاٹ پر سلا دیا۔ گوری گئی نہیں تھی۔ بھیم کو شبہہ ہوا کہ بڈھا پھر کہیں اس کا تذکرہ نہ چھیڑ دے لیکن منگرا نے لیٹتے لیٹتے گانا شروع کر دیا۔ دو ایک گیتوں کی کچھ کڑیوں کو دوہرا کر وہ بڑبڑانے لگا۔ کیا پردہ ہے؟ فلم میں کام کرتا ہوں اور ہانڈیا شراب پیتا ہوں۔ کسی کی کمائی تو نہیں کھاتا۔ اپنی کمائی کھاتا ہوں۔ ہم کو رام داس کا ہے کو زیادہ کھانے پینے کے بارے میں بولے گا؟ ارے رام داس، تم کو ہم مارے گا۔ تم کو ہم ضرور پیٹے گا۔ نشے میں بک جھک کر منگرا تھک کر سو گیا۔ منی کی بیمار ماں ایک کونے میں چپ پڑی تھی۔

منی اور گوری کھانا لے آئیں۔ بھیم اور دریودھن دونوں کھانے بیٹھ گئے۔ منی دونوں کے لیئے دو کٹوری شراب لے آئی۔

کھا پی کر دریودھن نے پوچھا ــــــ

"بھیم، کیرتن میں جائے گا یا کچھ دیر سوئے گا؟"

"ہمارے پہرے کی باری کتنے بجے سے ہے؟"

"بارہ بجے سے۔"

تو چل کیرتن میں چلتے ہیں، اب بھلا کیا سوئیں؟ کیرتن کے بعد پہرہ دے کر تھوڑی دیر سو رہنے کے بعد ہی کام پر چلے چلیں گے۔ مجھے چھ بجے بابو کے پاس پہنچنا ہی ہوگا۔"

دریودھن گوری کو پہنچا آیا۔ اس کے بعد دونوں نکل گئے۔ منی دروازہ بند کر کے سو رہی۔

ہر طرف یہ چرچا ہو چکا ہے کہ 'ستیہ یگ' پھر سے آ رہا ہے۔ ایک کتاب نکلی ہے جس میں لکھا ہے ــــ "کلکیہ اوتار ہوگا اور ملیچھوں (برے کام کرنے والوں) کو مار کاٹ کر ختم کر دے گا۔" اور تو اور 'کلکیہ' اوتار کی تصویر بھی نکلی ہے۔ لمبی داڑھی والے کلکیہ اوتار ہاتھ میں تلوار لیے گھوڑے پر سوار ہو کر ساری دنیا گھومیں گے۔ وہ کب ظاہر ہونے والے ہیں؟ اس کی تاریخ بھی متعین کر دی گئی ہے۔

متسیہ اوتار ہو چکا، کوم ہوا، براہ اوتار ہوا نرسنگھ، پرشورام، شری رام، کرشن بلرام، گوتم بدھ ان سب کے بعد کل یگ شروع ہوا۔ کل یگ میں لوگوں کے پاپ بڑھ گئے ہیں۔ ان پاپوں کو مٹانے کے لیے بھگوان کل یگ کے آخر میں اوتار بن کر آئیں گے۔ وہ دن بھی جلد ہی آنے والا ہے۔

اسی وجہ سے خیرجان چائے بگان میں نام کیرتن شروع ہو گیا۔ ستیہ یگ اور 'کلکیہ دیوتا' کا استقبال کرنے کے لیے لوگ تیار ہو گئے۔ بھیم، دریودھن وغیرہ نے میٹنگ کر کے اپنے نمائندے کمپنی کے پاس بھیجے اور 'کیرتن گھر' بنوانے کا انتظام کروایا۔ کمپنی کے مالکوں نے گھر بنوا دیا۔ دوسرے چائے بگانوں کی طرح

خیرجان میں بھی قطاروں میں کیرتن گھر کھڑے ہو گئے اور ہر رات کو مردنگ، جھانجھ ، ہارمونیم کے سُر گونجنے لگے۔ کیرتن میں لوگ متوالے ہوا ٹھے۔ وہ گناہ کرتے ہیں تو اس کا کفارہ ادا کرنا بھی جانتے ہیں۔ کل یگ میں سبھی پاپ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اب ستیہ یگ میں داخل ہونے کے لیے پاک وصاف کر لینا ہی پڑے گا۔ انسان تو گناہ و ثواب کا مجموعہ ہے۔

بہترے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مہاتما گاندھی 'کلکیہ اوتار' ہیں۔ ایک گاؤں کے کنوئیں میں پانی نہیں نکلتا تھا لیکن گاندھی جی کے وہاں پہنچتے ہی پانی نکلنے لگا اگر وہ دیوتا نہ ہوتے تو کیا ایسا معجزہ کبھی ہو سکتا تھا۔ سنتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کے سامنے جب ایک سانپ نکلا تو اسے بھی مارے بغیر چھوڑ دینے کے لیے کہا تھا۔ غرض کے اندھے بھلا اس بات کو کیا سمجھیں گے ؟"

لیکن اہنسا کی بات کرنے والے مہاتما ہتھیارے کر ملیچھوں کو کس طرح مار کاٹ کر تباہ کریں گے، یہ بات بحث کا موضوع تھی۔ گاندھی جی کی شکل بھی نو کلکیہ کی تصویر سے نہیں ملتی۔ چاہے جو ہو دریودھن اور اس کے ساتھی پابندی سے کیرتن گھر جایا کرتے۔ گاندھی کلکیہ ہو یا زمین پھاڑ کر ہی کوئی اوتار نکلے اس کی پوجا کرنا ہی ان کا مقصد تھا۔ آدھی رات تک وہ بڑی عقیدت سے کیرتن کیا کرتے۔ بوڑھوں میں سے بھی دو چار آدمی جایا کرتے تھے مگر وہ جلد ہی لوٹ جاتے۔ بچے، نوجوان، اور جوانوں نے ہی کیرتن کر کے لوگوں کی فلاح کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔

بھیم اور دریودھن کیرتن گھر میں جا کر گھسے اور پہلے کی طرح قطار میں بیٹھ کر کیرتن گانے لگے۔ تال۔ تال میں مردنگ، منجیرے اور ہارمونیم بج رہے تھے۔ پر لال کپڑے، سیندور اور سُرخ گڑھل کے پھول سجے ہوئے تھے۔ چراغ کی لو نے انہیں اور بھی سرخ کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی خوف سا محسوس ہونے لگتا۔ بھیم اور دریودھن خوف اور عقیدت کے ملے جلے جذبے کے ساتھ اس طرف دیکھتے اور کیرتن کیا کرتے۔

بھیم کو اچانک ہاکھر بھیا کی کہی ہوئی بات یاد آگئی ——— "سمجھتے ہو نا بھیم ! ہمارا ملک عجیب ہے۔ یہاں ایک طرف لوگ لائن میں شراب پی کر جھگڑے فساد کرتے رہتے ہیں تو دوسری طرف امن کیرتن گھر میں بھگوان کی پوجا بھی ہوتی رہتی

ہے"۔ بھیم کی سمجھ میں یہ بات صحیح طور پر نہیں آئی تھی اور اب تک بھی اچھی طرح سمجھ نہیں پایا ہے ——— باکھر بھیا نے پھر کہا تھا ——— پھر بھی تمہیں کیرتن گھر میں جانا چاہیے۔ وہاں تم اچھے بُرے کی پہچان کر پاؤگے۔ کیرتن گھر میں برے کام کا چرچا کرنے سے لوگ بہت ڈرتے ہیں۔ اسی لیے تمہیں کیرتن گھر جانا چاہیے۔

کیرتن ختم ہونے کے بعد بھیم اور دس آدمیوں کی ٹولی بستی کا پہرہ دیتی تھی۔ ہاتھوں میں لمبی لاٹھیاں لیے وہ پوری لائن کا چکر لگاتے تھے۔ بیڑی پیتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے، گاتے ہوئے وہ پہرہ دے رہے تھے۔ ان کی آواز سے کوئی ڈرتا نہیں تھا۔ ان کی سرگوشیوں کی آواز سن کر لوگوں کی نیند اور گہری ہو جاتی تھی۔ بستی کے شب بیداری کرنے والے کتے بھی انہیں دیکھ کر نہیں بھونکتے۔

تجربہ کار آدمی کی طرح بھیم کہتا ——— "لڑائی ہونے پر گھر میں بھی دشمن پیدا ہو جاتے ہیں ——— ہاں گھر اور عورتوں کی حفاظت کے لیے مردوں کو پہرہ دینا پڑ رہا ہے حالانکہ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔"

رات کے کوئی ڈیڑھ بجے تھے۔ آسمان پر باریک سا چاند۔ بھیم وغیرہ نے کسی آدمی کو آتے دیکھا۔ وہ چوکنے ہوا ٹھے۔ اتنی رات کو بھلا کون آیا؟ آدمی نزدیک آگیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی چال سے خوف کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

"کون ہے؟

"میں ہوں۔" آنے والے نے آسامی زبان میں جواب دیا۔

"تم کون؟" نوجوان نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"ڈرو مت، میں چور یا ڈاکو نہیں۔" اس نے کہا۔

بھیم نے آواز دی ———

"کیا چاہیے یہاں"؟

"کون بھیم ہو کیا؟ میں باکھر بھیا ہوں بھیم۔" اس کی آواز میں مسرت تھی۔

"باکھر بھیا"! بھیم حیرت زدہ تھا۔ "تم بھلا اتنی رات کو یہاں؟ بھائیو، آؤ تو آجاؤ۔ یہ باکھر بھیا ہیں۔ بڑے کرانی بابو کے بیٹے!"

منڈلی باکھر کے نزدیک آگئی ۔ دریودھن نے پوچھا ـــــــ
"کیا ہوا بابو ؟ تم بھلا اتنی رات کو یہاں کس لیے آئے" ؟
باکھر نے ہنس کر کہا ـــــــ
" وہ دونوں یہیں ٹھہرے ہیں ۔ میری سائیکل بھی رکھ لی ہے ۔ اگر ہو سکے تو تم لوگ کچھ کرو ۔ میں نے آنے سے انکار کیا تو مجھے مارنے کو بھی تیار ہو گئے "۔
منڈلی کا ہر آدمی ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگا ۔ دریودھن نے پوچھا ۔
"کیا تمہارے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پھینکی تھی" ؟
" نہیں ان کے پاس ٹارچ ہے مگر میرے منہ پر انہوں نے روشنی نہیں پھینکی ۔ باکھر بولا ـــــــ " میرا چہرہ ان لوگوں نے نہیں دیکھا "۔
دریودھن بولا ـــــــ
" آؤ بھائیو ۔ سالوں کو مزہ چکھائیں "۔
منڈلی فوراً آگے بڑھ گئی ۔ بھیم اور باکھر وہیں کھڑے رہ گئے ۔ کچھ منٹ بعد شور وغل اور کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی پڑی ۔ پانچ منٹ بعد وہ سائیکل لیکر لوٹ آئے ۔ باکھر نے پوچھا ـــــــ
" انہیں پیٹا ہے کیا" ؟
ایک نے بتایا ـــــــ
" دونوں کی تھوڑی بہت پٹائی ہوئی ہے "۔
دوسرے نے کہا ـــــــ
"کس تیزی سے بھاگے ہیں باپ رے باپ" !
منڈلی کے تین نوجوان دوسری راہ سے باکھر کو گھر پہنچانے چلے گئے ۔

گرین نے ایک دن کہا ـــــــ
" باکھر بھیا کبھی فیلڈ دیکھنے کیوں نہیں چلتے ۔ چل کر ابھی دیکھ آئیے نا ۔ ہوائی جہاز دیکھنے اتنے لوگ جا رہے ہیں جیسے چیونٹیوں کی قطاریں لگی ہوں ۔ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو لے چلوں گا "۔
"کیا سچ" ؟ باکھر بولا ـــــــ " ٹھیک ہے ۔ دیکھا جائے گا "۔

گرین آج کل مصروف آدمی ہے ۔ پو پھٹتے ہی خود سے چائے ناشتہ تیار کر کے کھا پی کر نکل جاتا ہے ۔ دوپہر کو بھی نہیں آتا ۔ شام کا دھندلکا پھیل جانے پر ہی واپس آتا ہے ۔ باکھر کو علم نہیں کہ وہ دوپہر کا کھانا کہاں کھاتا ہے ۔ ایک دن پتاجی کو کہتے سنا تھا ـــــــ

"گرین ! کیا یہ سچ ہے کہ تو نے کیمپ کا کھانا کھا کر ذات ہی گنوا دی" ؟

پہلے دن جب وہ کام پر نکلا تھا اس کا چہرہ دیکھ کر باکھر کو ہنسی آ گئی تھی ۔ دھوتی اتار کر ایک سستے قسم کا ریڈی میڈ ہاف پینٹ پہن کر پرانا کرتا اس کے اندر کر لیا تھا ۔ پیروں میں لمبی سوتی جرابیں اور کپڑے کے جوتے ، سر پر تیل کی چپچپاہٹ اور پانی ڈال کر ان میں کنگھی کی گئی تھی ۔ ہاتھ میں مزدوروں کا رجسٹر اور منہ میں بیڑی لیے جب وہ جنگِ عظیم کے میدان میں نکل گیا تب ہی جا کر باکھر کی ہنسی کسی طرح رک پائی تھی ۔

رات کو کھا پی کر ہمیشہ گرین روپے کا حساب کیا کرتا تھا ۔ نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ اور زبان کی گٹ پٹ باکھر اپنے کمرے میں سنتا اور دل ہی دل میں ہنستا ۔ بھیم نے بتایا تھا ـــــــ سنتے ہیں فل بابو کافی روپیہ مارا کرتا ہے ۔ کام پر نہ جانے والے مزدوروں کے نام اگر حاضری رجسٹر پر چڑھا دے یا فاضل وقت کا فرضی کام دکھا دے تو فلی رشوت دیا کرتے ہیں ۔

گرین آج کل کپڑے وغیرہ بھی اچھے پہنا کرتا ہے ۔ ایک دن باکھر پر دباؤ ڈال کر بہنی چکیا لے گیا تھا اور وہاں سے کپڑے اور جوتے خریدے تھے ۔ دن بدن اس کا چہرہ بدلتا جا رہا تھا ۔ کھانے میں گوشت مچھلی کا انتظام وہ خود کرتا ہے ۔ یا تو بازار سے خرید لاتا ہے یا کام پر نہ جانے والے کسی مزدور کا نام حاضری رجسٹر پر چڑھا کر اس کے ہاتھ بھجوا دیا کرتا ہے ۔ صبح صبح کام کاج میں جانا پڑتا تھا ۔ اسی لیے وہ ناشتہ بھی نہیں کر پاتا تھا ۔ بھیم اس کے لیے جو پاؤ روٹی رکھے رہتا اسے ہی کھا کر چلا جاتا ۔ کھانے کے لیئے وہ ملٹری گودام سے اکثر مکھن ، پنیر وغیرہ پار کر لاتا اور کبھی کبھی بازار سے بھی مکھن یا جام کے ڈبے خرید لاتا ۔ باکھر چپ چاپ دیکھا کرتا کس طرح دن بدن اس آدمی میں تبدیلی آتی جا رہی ہے ۔

شاکیہ کے گھر سے منسلک تقریبًا تین میل لمبی اور ڈیڑھ میل چوڑی وسیع

ڈھلان تھی۔اس کے درمیان سے ایک چھوٹا سا چشمہ بہتا تھا۔اور اس کے دونوں جانب کھیت تھے۔ شاکیہ وغیرہ اس جگہ کو کھڈا کہا کرتے تھے۔چائے مزدور وہاں دھان روپتے۔برسات میں جب چشمہ امنڈ کر الٹا بہنے لگتا ہے تب لوگ بڑی بڑی بھاکر، گونیا وغیرہ مچھلیاں پکڑا کرتے ہیں۔گہرے پانی میں قطار بنا کر 'مرّاٹھ' (جنگلی بکریاں) اپنے بچوں کے ساتھ چھپ چھپ کرتی ہوئی دلدل کی نرم گھاس چرا کرتی ہیں۔جل کنبھی پانی پر لہلہا کر بڑھ آتی ہے۔پانی پاتے ہی ان سب کو کیسے نئی زندگی مل جاتی ہے، باکھر اکثر اس کے بارے میں سوچا کرتا۔جو گرین کل تک ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا وہ بھی جنگِ عظیم کی کرامت سے ٹھیک اسی طرح سے سر اونچا کر رہا ہے۔

ہوائی اڈہ دیکھنے کی تجویز باکھر کو ناپسند نہیں معلوم ہوئی۔فیلڈ دیکھ کر آنے والوں کی زبانی انگریزوں کے عجیب وغریب آلاتِ حرب کے بارے میں سن کر اسے بھی دیکھ آنے کی خواہش ہوئی تھی۔

بھیم نے پھر ایک دن کہا ——

"بھیا چلو ہم بھی ایک دن فیلڈ دیکھ آئیں۔فل بابو کے ساتھ چلیں گے۔"

باکھر بولا ——

"ہاں ایک دن جانا ہی ہے۔فل بابو کیا ہمیں فیلڈ کے اندر لے چل سکیں گے"؟

"کیوں نہیں؟ ضرور لے چل سکوں گا۔" گرین بولا۔

یہ طے ہوا کہ ایک دن دوپہر کو وقت نکال کر گرین کھانا کھانے گھر آئے گا اور باکھر وغیرہ کو ساتھ لے جائے گا۔ایک دن باکھر کا اسکول بند تھا۔اسی دن جانا طے ہوا۔فیلڈ کے گیٹ کے سامنے پہنچتے ہی گڑ بڑی ہوگئی۔ملٹری پولیس نے راہ روک دی۔اندر جانے پر پابندی تھی۔صرف کام کرنے والے، کام تلاش کرنے والے اور جانے پہنچانے لوگوں کو ہی اندر جانے کی اجازت تھی۔

گرین نے ہندی، آسامی، انگریزی وغیرہ کی کھچڑی زبان میں پہریدار سپاہی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ فیلڈ میں کام کرتا ہے۔اس لیے اس کے اندر جانے میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن سپاہی نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ

وہ اسے پہچانتے نہیں تھے۔

باکھر بہت شرمندہ تھا۔ اس نے کہا ——

"گرین رہنے دو! لوٹ چلو، نہیں چاہیئے۔"

گرین بولا ——

"نہیں، نہیں ذرا رکیے میں تو جیسے تیسے جا سکتا ہوں، یہ دونوں ایم پی آج نئے آئے ہیں اسی وجہ سے مجھے پہچان نہیں پائے۔"

تب ہی ایک جیپ آکران کے پاس رکی۔ دو فوجی افسران اترے۔ ایک گورا دوسرا نیگرو۔ نیگرو نے گرین کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر آواز دی ——

"ہیلو جارج! کیا خبر"!!

گرین 'ہاجریکا' لکھتا تھا۔ اسمیا لفظ امریکی زبان پر نہ چڑھنے کی وجہ سے ہاجریکا کو 'جریکا' سے امریکن 'جارج' بنا لیا تھا! اس بار گرین کے چہرے پر ہنسی کھل اٹھی۔ وہ معاملہ سمجھانے لگا۔

گورا وہی افسر تھا جس نے باکھر سے کتابیں لی تھیں۔ اس نے باکھر کے پاس آکر ہاتھ ہلا ہلا کر پوچھا ——

"کیا سماچار ہے آپ کا؟ کیا فیلڈ دیکھنے آئے ہیں؟"

"جی ہاں"! باکھر نے ہنس کر گرین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ صاحب یہاں کام کرتے ہیں۔ یہ ہمیں فیلڈ دکھانے لاکر گیٹ کے سامنے مصیبت میں پڑے ہیں۔ ایم۔پی اندر جانے نہیں دے رہا۔ اس لیے اب ہم لوٹ ہی جانا چاہتے ہیں۔"

"نہیں، نہیں"۔ افسر نے کہا۔ "بھلا لوٹ کیوں جائیں گے؟ کیا میں کوئی انتظام نہیں کر سکتا؟ سارجنٹ ذرا ادھر آؤ۔"

نیگرو سارجنٹ، افسر کے ساتھ ایم۔پی کے پاس گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی لوٹ کر باکھر وغیرہ کو جیپ پر سوار ہونے کے لیے کہا۔ سارجنٹ بھیم اور گرین کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور بولا ——

"صاحب آپ لفٹیننٹ کے ساتھ سامنے بیٹھیے نا۔ میں دوست جارج کے ساتھ یہاں بیٹھ رہا ہوں۔"

جیپ چل پڑی ۔ راہ میں لوگوں اور گاڑیوں کی بڑی بھیڑ تھی ۔ ان کے درمیان سے ہی افسر مستعدی سے جیپ چلا کرلے جا رہا تھا ۔ پچھلی سیٹ پر سارجنٹ اور گرین کسی موضوع پر کانا پھوسی کرتے ہوئے کھی کھی ہنس رہے تھے اور بھیم حیرت سے فیلڈ دیکھ رہا تھا ۔

افسر بولا ـــــ " میں آپ کو تلاش کرتا ہوا اسکول گیا تھا ۔"

" سچ ! مگر آج تو ہمارا اسکول بند ہے ۔"

" اس دن کے واقعے کے بارے میں میں نے بارہا سوچا ۔ اس کے متعلق میں آپ کو بتانا مناسب سمجھتا ہوں ۔"

" کون سی بات ؟ " باکھر نے پوچھا ۔

" وہی جیبی کی بات ! اس نے مجھ سے کہا تھا ، لفٹیننٹ صاحب ، میں اس آدمی سے کچھ مذاق کروں گا ۔ میں نیا آدمی ٹھہرا ، وہ کیا کرنا چاہتا ہے ، میں سمجھ نہیں سکا تھا ۔ جیبی بالکل نادان ہے ۔ وہ ہندوستان کے ہر آدمی کو ایک ہی جیسا سمجھتا ہے ۔ خاص کر گذشتہ چھ ماہ سے یہاں کے مزدوروں کے علاوہ کسی سے اس کا رابطہ نہیں رہا ہے ۔ میں نے بعد میں اسے کافی ڈانٹا تھا ۔ ہندوستان کے بارے میں مجھے جتنا علم تھا میں نے اسے سمجھا دیا ہے ۔"

وہ ایک جگہ رک کر گاڑی سے اتر گئے ۔

قریب میل بھر لمبی اور فرلانگ بھر چوڑی جگہ کو کنکر پتھر ڈال کر پکا کیا جا رہا تھا ۔ وہیں ہوائی جہاز اترا کرتے ۔ کام کرتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی چیز جھک کر چن رہے ہیں ۔ ایک بڑے پہیے والی گاڑی جس میں کولتار بھرا ہوا تھا اس پر کول تار ڈال رہی تھی ۔ کچھ مزدور کنکر لاکر وہاں بکھیر رہے تھے ۔ راستے کے کنارے بیٹھی مزدور عورتیں بڑے بڑے پتھروں کو ہتھوڑوں سے توڑ رہی تھیں ۔ کتنی طرح کی گاڑیاں آرہی تھیں ۔ کچھ گاڑیاں تو صرف آتی ہوئی دکھائی پڑ رہی تھیں ۔

" کام کی جگہ جا رہا ہوں " کہہ کر گرین سارجنٹ کے ساتھ اس طرف چلا گیا جہاں قطاروں میں بیٹھی لڑکیاں پتھر توڑ رہی تھیں ۔ باکھر ، افسر اور بھیم وہاں کھڑے ہو کر لوگوں کا کام دیکھنے لگے ۔ اچانک لوگ ایک ساتھ ہی کام کرنا چھوڑ کر فیلڈ

کے ایک سرے پر دوڑ گئے۔ باکھر پہلے سمجھ نہیں سکا کہ یہ لوگ کیا دیکھ کر یا کس کے خوف سے اس طرح بھاگے جا رہے ہیں۔ افسر نے بتایا کہ یہ لوگ سگنل دینے کی وجہ سے ہٹ گئے ہیں۔ ہوائی جہاز اترنے والا ہے کچھ ہی دیر بعد ایک عظیم الشان بار بردار ہوائی جہاز پچھم کی طرف پہلے ایک نقطے کی طرح دکھائی پڑا۔ پھر بتدریج بڑا ہو کر نیچے اتر پڑا۔ ایسا محسوس ہوا کہ اس کا جھونکا دور کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی کپڑوں سمیت اڑا لے جائے گا۔

تینوں آدمی جیپوں پر بیٹھ کر آگے بڑھ گئے۔ لوگ تب تک پھر کاموں میں جٹ گئے تھے۔ شور وغل کے مارے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ محرر بیچ بیچ میں چکر لگا کر کاموں کی نگرانی کر رہے تھے۔ سردار لاٹھیاں اٹھاتے، گالیاں بکتے پھر رہے تھے۔ ملٹری والے چہل قدمی کرتے ہوئے چیخ چیخ کر بتا رہے تھے کہ کام کیسا ہونا چاہیے۔

جیپ ایک کشادہ جگہ سے گزر رہی تھی۔ اس کے دونوں طرف ٹوٹی پھوٹی طرح طرح کی گاڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ فوجی اور غیر فوجی کاریگران کے اوپر نیچے بیٹھے یا کھڑے ہوئے کام کر رہے تھے۔ افسر نے بتایا ـــــ مرمت! باکھر سر ہلا کر ہنس پڑا۔

ایک جگہ جیپ کھڑی کر کے تینوں کو اتر جانا پڑا۔ ایک طرف کی گپھا جیسی جگہ سے کہیں اڑ جانے کے لیے ایک ہوائی جہاز نکل رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے پنکھے ان لوگوں کے اوپر سے نکل گئے۔ پھر آگے بڑھنے پر بائیں طرف کا ایک مکان دکھا کر افسر نے بتایا ـــــ رسوئی گھر! وہاں کھانا پک رہا تھا۔ سفید وردیاں پہنے اور سر پر سفید فوجی ٹوپ لگائے امریکی باورچیوں کو دیکھ کر باکھر مسکرا پڑا۔ بہت سے ہندوستانی مزدور ان کی مدد کر رہے تھے۔ کچھ لوگ آلو، سیم، مٹر وغیرہ سبزیاں دھو کر کاٹ رہے تھے۔ کچھ لوگ گرم پانی میں برتن دھو رہے تھے۔

تقریباً نصف میل چلنے کے بعد جیپ ایک جگہ رک گئی۔ بائیں طرف ایک آفس کے سامنے بے شمار لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں ہندوستانی بڑے ہی مایوس اور بجھے ہوئے لگ رہے تھے اور دوسرے لوگ بہت ہی مصروف۔ کبھی کبھی کوئی امریکن سپاہی باہر آ کر ہندوستانیوں کے ساتھ کچھ

بات چیت کرتا تھا۔ افسر نے بتایا ــــــ

"یہ ہمارا لائسزان آفس (دفتر تقرری) ہے۔ یہاں نئے نئے لوگ بھرتی کیے جا رہے ہیں۔ ہمیں ابھی بہت سے سول میکینک چاہئیں ــــ حالانکہ کلرک بھی لیے جا رہے ہیں۔ یہ ایک ملٹری کینٹین ہے۔ سڑک کے اس پار وہ تھیٹر ہے، وہاں سینما دکھایا جاتا ہے۔"

نیچے کھڑکیوں سے کینٹین کے اندر کام کرنے والی گوری عورتیں دکھائی پڑ رہی تھیں۔ کینٹین کے اندر بڑی بھیڑ تھی۔ تھیٹر ہال سے اچانک ملٹری افسر اپنی میم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر نکلا۔ بھیم نے مسکرا کر سر جھکا لیا ــــ دھت! نہ لاج نہ شرم۔

وہ پھر جیپ میں سوار ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ سڑک کے دونوں طرف کیمپوں کی قطاریں دو" میو ہالو" یا رسوئی گھروں کو پار کر کے وہ آگے بڑھے۔ دونوں میں پہلے جیسی ہی دوڑ دھوپ اور مصروفیت تھی۔ افسر نے بتایا ــــ

"ان کیمپوں میں دو اسکواڈرن فوج رہتی ہے۔ وہ لکڑی کے کھمبے کی جو نشانی دکھائی دے رہی ہے، وہ نشانی اسے ملتی ہے جس کا کیمپ سب سے صاف ستھرا رہتا ہے۔ سپاہیوں میں اس کے لیے بہت سخت مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ میرے علم میں اب تک ایک سو نمبر والے کیمپ کو ہی دو بار یہ نشانی ملی ہے۔"

ایک جگہ ایک میدان میں کچھ ننگے سے سپاہی' سن گلاس' لگائے گیند اچھال رہے تھے۔ افسر نے بتایا کہ دور دراز ملکوں میں رہ کر اور انہیں چیزوں میں مصروف رہ کر گھر کی باتیں بھولے رہتے ہیں۔

باکھر خاموش رہا۔ افسر نے پھر کہا ــــ

"چلیے، ادھر سے ہیڈ کوارٹر کے پوپ کی طرف سے نکل جائیں۔

ہیڈ کوارٹر کا دفتر پار کر کے، چائے کے پودوں کے درمیان سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ اس نے ایک بار پوچھا ــــ

" دیکھتا ہوں آپ تو ایک دم خاموش ہیں۔ فیلڈ دیکھ کر کیسا لگا؟"

باکھر نے ہنس کر کہا ــــ

" اچھا لگا۔ مگر میں ایک دوسری بات دل ہی دل میں سوچ رہا ہوں۔

سوچتا ہوں کہ ڈنڈ ما کی یہ مصروفیت ہماری نہیں آپ لوگوں کی ہے اور سوچتا ہوں کہ ہمارے یہاں کے لوگ اسے ہضم کرسکیں گے یا نہیں "!

وہ لوگ پھر ہوائی اڈے پر آپہنچے ۔ افسر جیپ کو ایک گوشے میں واقع بنگلے پرلے گیا ۔ باکھر کو یاد آیا ۔ اسی مکان میں کبھی چوکیرٹی چائے بگان کا ایک انگریز افسر رہا کرتا تھا ۔ پاس کے کارخانے اور مکانوں میں اب ایم ۔ ای ۔ ایس کے دفتر اور گودام ہیں ۔

" ہیلو ، سیکو ! افسر نے بنگلے میں جاکر ملازم لڑکے کو پکارا ۔ لمبی پینٹ اور سفید کرتے ، چمک دار بوتوں اور جرابوں میں سجے اس لڑکے نے امریکن جیسے لہجے میں ہی جواب دیا ——

" ہیلو ، نیوٹانینٹ " ! باکھر پہلے تو پہچان ہی نہیں پایا ۔ لیکن اس نے باکھر کو پہچان کر اپنا تعارف کرایا —— " نمسکار سر "

" کون ! ارے بودھن " باکھر حیرت زدہ تھا ۔ " جی ہاں سر "

افسر نے پوچھا ——

" آپ اسے پہچانتے ہیں کیا ؟

باکھر بولا ——

" جی ہاں ، یہ میرا شاگرد تھا "

" او ، ایسی بات ہے ۔ ٹھیک ہے ۔ آئیے میرے کمرے میں ! سیکو ، اس مین کو ایک چیئر اور آفٹراے فیو منٹس ادھر آؤ " —— (یعنی لڑکے اس آدمی کے لئے کرسی دے جا اور چند منٹ بعد آجانا ۔

باکھر لیفٹیننٹ کے صاف ستھرے کمرے میں آگیا ۔ ریوالور بیلٹ ہسن ہیلمٹ (دھوپ سے بچنے کا ٹوپ) ، اسٹیل ہیلمٹ (لوہے کا ٹوپ) ، خاکی وردی ، کیلے کے پتے جیسے کمبل وغیرہ سامانوں سے یہ بات صاف جھلکتی تھی کہ وہ کسی فوجی کی رہائش ہے ۔ لیکن باکھر کے ذہن میں پرانے بنگلے اور آج جہاں ایم ۔ ای ۔ ایس کے کام ہو رہے ہیں ۔ ان چائے کارخانوں کی بات گردش کر رہی تھی ۔ ملک کی حفاظت کے نام پر ، حکومت کی حفاظت کے نام پر ، طاقت ور ملکوں کے چنگل

سے ملک اور تہذیب کو محفوظ رکھنے کے نام پر — چاہے جس نام پر ہی کیوں نہ ہو، کتنے برسوں سے چائے کی کھیتی بند ہو گئی ہے۔ چائے کی تجارت پس پشت جا پڑی ہے۔ چائے کے پودے اکھاڑ ڈالے گئے۔ چائے مزدوروں کو کمپنی والوں نے دوسرے چائے بگانوں میں لے لیا۔ کمپنی نے جن ملازمین کو بھولتیں دیں وہ تو کام میں لگ گئے باقی محض سارٹی فیکیٹ لے کر کسی گاؤں یا محلے میں گھس پڑے۔ متعدد لوگوں کے کام کی روش بدل گئی۔ بہت دن سے لگاتار بہنے والے چشمے کا راستہ اچانک بدل گیا۔ اسے چاہ کر یا مجبور ہو کر ایک نئے راستے پر بہنا پڑا۔ یہ تبدیلی کس طرح کے مستقبل کی بشارت ہے، کون جانے؟

باکھر میز پر پڑی ہوئی ایک کتاب کھول کر دیکھ رہا تھا۔ پہلے اس کے مالک کے نام پر نظر پڑی — لیفٹیننٹ ڈی گریبلس 1337، یونٹ 20، یو۔ ایس۔ آرمی افسر نے نزدیک آ کر ہنستے ہوئے کہا —

"میرا نام دیکھ رہے ہیں۔ پورا نام ہے ڈیوڈ گریبلس! ہاں ٹھیک یاد آیا۔ آپ اپنا نام پتہ مجھے لکھ دیجیے۔" اس نے ایک ننھی سی نوٹ بک نکال کر دی اور باکھر نے اس پر اپنا نام پتہ لکھ دیا۔ اس نے خود بھی کاغذ کے ایک ٹکڑے پر گریبلس کا نام پتہ لکھ لیا۔

ایک بار باکھر نے کہا —

"ٹھیک ہے مسٹر گریبلس! اوہ آپ کا نام تو پکارنے میں بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں، تو آپ مجھے صرف ڈیوی کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو بہت آسان ہوگا؟ مجھے گھر میں بھی سبھی ڈیوی ہی کہا کرتے ہیں۔ ہم امریکن تو بے تکلف دوستوں کو مختصر نام سے ہی پکارنا پسند کرتے ہیں۔"

"سچ!"

"ہاں، مگر میں تمہیں کس نام سے پکاروں، شاکیہ یا باک اور۔ ۔ ۔"

اور امریکن جس نام سے بے تکلف دوست کو پکارنا پسند کرتے ہوں۔"

ڈیوڈ ہنس پڑا۔

بودھن نے کاغذ کے کپ میں ایک طرح کا پھلوں کا رس لا دیا۔ ڈیوڈ

نے بھیم سے کچھ کھانے کی چیز لانے کا بھی اشارہ کیا۔ رس پی لینے کے بعد وہ غیر رسمی باتیں کرنے لگے۔ ڈیوڈ اپنا ایک فوٹو البم لے آیا اور اسے اپنے خاندان کے تمام افراد کی تصویریں دکھا کر ان سے غائبانہ تعارف کروایا۔
وہ آسٹریلیا کے رہنے والے تھے۔ ان کے اجداد اپنی جوانی میں امریکہ آکر وہاں مستقل طور پر بس گئے۔ ڈیوڈ اس کے دادا کا نام ہے۔ اس کے گھر اُسی لے نواس' میں آج کل اس کی دادی، ماں باپ، بڑے بھائی، ایک بہن اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ بڑے بھائی کی شادی ہو چکی ہے۔ بہن کالج میں پڑھتی ہے اور چھوٹا بھائی اسکول میں پڑھتا ہے۔ باپ ایک بڑے بنک کے خزانچی ہیں۔ بڑے بھائی کالج میں پروفیسر ہیں اور ڈیوڈ خود ایم۔ اے ہے۔ بہن کیرولن بہت ذہین ہے اور ڈیوڈ کو یقین ہے کہ وہ وقت آنے پر ایک دانشور خاتون بنے گی۔ چھوٹے بھائی ہینری کا دل پڑھائی لکھائی میں زیادہ نہیں لگتا۔ وہ کھیل اور فوٹوگرافی میں زیادہ مست رہتا ہے۔ ڈیوڈ کے لوٹنے پر ایما نام کی لڑکی کے ساتھ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ ایما نیویارک کے ایک متوسط کلرک کی لڑکی ہے۔ ایک دن ایما اپنی آیا سے ملنے لاس اینجلس گئی تھی وہاں ایک دشواری میں پڑ گئی۔ ڈیوڈ وہاں گھومنے گیا تھا۔ اس نے ایما کا مسئلہ حل کر دیا۔ وہیں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد خط وکتابت ہوتی رہی۔ پھر ڈیوڈ کے خفیہ نیویارک سفر سے دونوں خاندان میں بات پھیل گئی۔ آخر میں خزانچی اور پروفیسر نے نیویارک جا کر اس کلرک کے ساتھ بات پکی کر لی لیکن جنگ کی وجہ سے ڈیوڈ کو سمندر پار ہندوستان آنا پڑا۔

"میں تمہارے بارے میں کیرولن اور ایما کو لکھوں گا، باکھر!"
ڈیوڈ رو میں کہتا گیا ـــــــ
"دیکھنا، انہیں یہ بات کتنی پسند آئے گی۔ ماں تو میرے دوستوں کو بہت پیار کرتی ہیں، اپنے ہی بیٹے کی طرح۔ میں ایک دو دن میں تمہارا فوٹو بھی بھیج دوں گا۔"
اس کے بعد ڈیوڈ باکھر اور بھیم کو جیپ پر بٹھا کر ڈمڈما پہنچا گیا۔ وہ خیر جان

تک پہنچانا چاہتا تھا لیکن باکھر کے عذر کرنے پر کہ اسے وہاں کچھ کام ہے، وہ ڈنڈما سے واپس لوٹ گیا۔

بھیم کو گھر بھیج کر باکھر روشنائی کی بوتل خریدنے کے لیے ایک جنرل اسٹور میں داخل ہوا۔ دوکان نئی تھی۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں سستی، قیمتی لاتعداد چیزیں جیسے تیسے بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ آئینہ، کنگھی، اسٹیشنری، تیل پوڈر اور دوسری مصنوعات، جوتے، موزے، اونی کپڑے، طرح طرح کے کھیل کے سامان وغیرہ سامنے کاؤنٹر پر سگریٹ کے پیکٹوں کی قطاریں سجی ہوئی تھیں۔ دوکان کے مالک بدرالدین سے باکھر کی شناسائی ہے۔ مڈل اسکول میں وہ دونوں ہم جماعت تھے۔ انگریزی گرامر یاد نہ کر پانے کی وجہ سے اسکول میں سیکنڈ ماسٹر نے بدر کی کافی پٹائی کی تھی۔ باکھر کو آج تک یہ بات بخوبی یاد ہے۔ پانچویں جماعت سے ہی بدر نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ وہ باکھر کا ہم عمر تھا۔ اس کے بعد کافی عرصے تک وہ ایک سائیکل پر چکر لگاتا رہا تھا۔ آج وہی بدرالدین ٹھاٹ باٹ سے رہنے والا، نفیس سوٹ پہننے والا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے والا تاجر ہے۔ اس کے سگریٹ کے دھوئیں کے مارے یہ حالت ہے کہ ایک آنکھ ہمیشہ بند ہی رکھنی پڑتی ہے۔

دوکان میں اس وقت امریکن سپاہیوں کی ایک ٹولی گھسی ہوئی تھی۔ کالے گورے دونوں طرح کے لوگ تھے۔ باہر کھڑے باکھر پر نظر پڑنے کے باوجود بھی اس وقت بدرالدین کو اس سے بات کرنے کی فرصت نہیں تھی — جنگِ عظیم کی مصروفیت ایسی ہی ہوتی ہے لیکن باکھر کے مزاج میں تحمل تھا اس لیے وہ انتظار کر سکتا تھا اور اس وقت تو امریکنوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے بھی اسے اچھا لگ رہا تھا۔ کافی دیر بعد امریکنوں کی ٹولی دوکان سے باہر نکلی۔ کسی کے ہاتھ میں گول آئینہ، کسی کے ہاتھ میں شیشے کا گلاس، کوئی سگریٹ کا پیکٹ لیے اور کوئی رائیٹنگ پیڈ سنبھالے۔ دوکان کے سامانوں کو گھوم پھر کر دیکھنے کے بعد وہ نکل گئے۔ کوئی کوئی باکھر کو اس انداز سے دیکھتا جیسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو اور شاید اسی وجہ سے آنکھ دبا کر پکار لیتا ہے — ہیلو!

ان کے جانے کے بعد باکھر باہر کھڑا بدر کا منتظر رہا جو ابھی روپے گننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر بدر کو آواز نہیں دی۔ دماغ پر زور دیتا ہوا حساب جوڑنے کے دوران وہ باہر بھی دیکھ لیتا تھا۔ پھر بھی درمیان میں آواز دینے سے حساب گڑبڑ ہو جانے کا امکان تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اسس نے آواز دی ——

"کیا چاہیئے"؟

جیسے وہ باکھر کا نام ہی بھول چکا ہو۔ باکھر نے سوچا اور پھر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ بدر بے دلی سے نشست گاہ سے اٹھا۔ باکھر نے دوکان کے اندر گھستے ہوئے کہا ——

"مجھے ایک بوتل سیاہی دینا بدر"!

"'سی بی ٹی' ہے" بدر بولا —— "تین روپے لگیں گے۔ دے دوں؟"

"دے دو"۔ باکھر نے ایک ایک روپے کے تین نوٹ نکال کر دیدیے۔

سیاہی کی ایک بوتل نکال کر دیتے ہوئے بدر بولا ——

"صرف تمہیں کو تین روپے میں دے رہا ہوں، امریکنوں سے پانچ روپے سے کم نہیں لیتا"۔

"میرے لیے کہیں نقصان نہ کر بیٹھنا!" باکھر بولا۔

"نہیں، نہیں تم تو امریکن نہیں ہو"۔ بدر نے بات سنبھالی۔

"ہاں ٹھیک کہتے ہو"۔ باکھر نے اس کی بات تسلیم کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، لاؤ"۔

"کیا بیٹھو گے نہیں؟"

"نہیں اب چلوں"۔

باکھر سڑک تک پہنچا تو بدر نے پکارا ——

"باکھر سگریٹ پیو گے۔ آؤ آؤ"۔

"رہنے دو، نہیں چاہیئے"۔

قدم بڑھاتے ہوئے باکھر بدر کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ حالات

انسانی ذہن کو کس طرح تبدیل کر دیتے ہیں۔ بدر کے باپ کی صرف ایک چھوٹی سی دوکان تھی، پان کی۔ معمولی پڑھا لکھا تھا۔ کچھ حکیمی دوا دارو کرتا تھا اور کسی طرح سے گذر اوقات کر لیتا تھا۔ بدر جب مڈل اسکول میں پڑھتا تھا تو اس کے جسم پر ایک بوسیدہ سی قمیص اور پیوند لگی ہاف پینٹ ہوتی تھی اور غربت اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتی تھی۔ بازاری لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کو دنے میں سماجی یا خاندانی کسی طرح کی روک ٹوک نہیں تھی جس کے باعث بدر کا رجحان پڑھنے لکھنے کی جانب بہت کم تھا۔ بدرالدین نے پانچویں کلاس سے ہی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر لیا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو اس کے والد کی مالی مجبوری تھی اور کچھ اس کی اپنی مجبوری کیونکہ وہ خود کو ذہنی طور پر اسکول کے بچوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر پاتا تھا۔ تعلیمی سلسلہ ترک کرنے کے بعد وہ اس اینٹ، کنکر اور پتھر کے شہر میں آوارہ گردی کرنے لگا۔ باپ کی ڈانٹ ڈپٹ اور دو لقمے کھانا کھا کر بس وہ دن بھر گھر سے باہر رہتا تھا۔ یہی تھا اس کا ان دنوں کا معمول۔ ہاف پینٹ چھوڑ کر وہ ان دنوں زیادہ تر لنگی یا پاجامہ پہننے لگا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ مقامی سنیما ہال میں پندرہ روپے مہینے پر گیٹ کیپر کا کام کرنے لگا تھا۔ بچپن کے دوست باکھر سے اس درمیان میں ملاقات ہونے پر بھی وہ بات کرنے میں جھینپ جاتا تھا۔ صاف کپڑے پہنتے، شریف آدمی کی طرح رہنے والے اور کالج میں پڑھنے والے نوجوان باکھر سے لنگی پہنے بازار میں چکر لگانے والا گیٹ کیپر بدر بات کرنے میں بھی خجالت محسوس کرتا تھا۔

اور آج! آج وہی بدر، باکھر سے بات کرنے میں بھی سبکی محسوس کرتا ہے۔ بازاری زندگی کی وہ بات نہ کرنے والی ہچکچاہٹ کا احساس جیسے آج انتقام لینا چاہتا ہو۔ دنیا کی رفتار آج بدل گئی ہے۔ بدرالدین کی دنیا میں آج عیش و عشرت کا سیلاب آگیا ہے۔ باکھر کتنا پیسے والا ہے، اس کے پاس نہ جانے کتنے روپے ہیں۔ باپ خیر جان چائے بگان کا کرانی ہی تو ٹھہرا؟ ہشت! باکھر نوکر ہے، اسکول میں نوکری کرتا ہے۔ بدر آزاد تاجر ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ دوکان میں باپ کو بٹھا کر خود جا کر ملٹری کی ٹھیکیداری کرے گا۔ ڈبرو گڑھ کے بنک سے چند ہزار روپے نکال لائے گا۔ لڑائی کے بازار میں تو معمولی اور

نکھٹو قلی بھی جنگل کے خودرو بانسوں کی چٹائیاں بناکر لکھ پتی بن گئے ہیں ۔ بھلا بدرہی کیوں بیٹھا رہے ؟ جنگِ عظیم ـــ زندہ باد!

"باکھر سائیکل سے نہیں جاؤ گے کیا؟" پیچھے سے کسی کی آواز سن کر وہ مڑا۔ ایک چھوٹی سی سائیکل کی دوکان سے نظام پکار رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ سائیکل یہیں رکھ کر گیا تھا۔ بدرالدین کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ رو میں کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ اس دھن میں وہ بھول ہی گیا تھا کہ اس نے سائیکل نظام کی دوکان میں رکھی ہے ۔ وہ پھر دوکان کی جانب پلٹا۔

"ہوائی جہاز دیکھا؟" نظام نے سوال کیا ـــ "بیٹھو"

دوکان کی اس اکلوتی کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔ ایک لمبے سے مکان کا چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے کر تقریباً چار ماہ قبل ہی اس نے دوکان کھولی تھی۔ پہلے وہ ٹرنک روڈ پر واقع اپنے ماموں کی دوکان میں کام کرتا تھا۔ نوجوان نظام کی دوکان پر زیادہ تر سائیکلوں کی مرمت ہی ہوا کرتی ہے۔ نئی چیزیں کم ہی ہیں۔ صرف کچھ مڈگارڈ، کچھ ٹائر، ٹیوب، اسپارکوں کے دو مٹھے اور سائیکل کا کچھ ضروری سامان۔ پھٹے پرانے ٹیوب، ٹائر، مرمت کے کام میں آنے والے رینچ ادھر اُدھر بکھرے ہوتے ہیں. ایک شکستہ میز اور یہ ایک بغیر ہتھے کی کرسی ۔ یہی اس کی کل دوکان ہے ۔

باکھر بولا ـــ "ہاں ، دیکھ لیا۔"

"کیسا لگا ؟"

نظام نے دیا سلائی اور کاغذ سمیت سگریٹ کمپچر کا ڈبہ نکال کر باکھر کے سامنے رکھ دیا۔ کونے میں ٹنگے پردے کی جانب مڑ کر بولا ـــ

"بھائی او ، دو تامول دینا"

اندر سے ایک بوڑھی عورت نے کہا ـــ "دے رہی ہوں ۔"

باکھر بولا ـــ "کیا پوچھتے ہو۔ وہ چیزیں دیکھی ہیں جن کے بارے میں کبھی سنا بھی نہ تھا اور دیکھنے کا سوال ہی کیا ؟ میں تو اس وقت سے یہی سوچ رہا ہوں کہ ہمارے یہ کالے لوگ جس طرح ہوش و حواس کھو کر اس میں پڑ گئے ہیں ۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ان سارے لوگوں کو لے کر ہم کیا کریں گے ؟"

"کیوں"؟

"سبھی لوگ ملٹری فیشن والے بن گئے ہیں۔ لڑائی ختم ہو جانے پر بھی بھلا یہ کبھی ہماری پرواہ کریں گے۔؟

نظام رنچ سے سائیکل کا پہیہ کھولنے میں مصروف تھا۔ بولا ——

"پہلے لڑائی کو تو ختم ہو لینے دو پھر دیکھا جائے گا۔"

پردے کے اس پار سے نظام کی ماں نے آواز دی ——

"پان لے جا، او نظام۔"

نظام نے تاموں لاکر باکھر کو دیا۔ باکھر بولا ——

"نظام تم تو یہ دوکان نہ کھول کر فیلڈ میں میکینک کا کام کر سکتے تھے۔ فیلڈ میں کافی پیسے ملتے ہیں۔"

نظام ہنس پڑا۔ بولا ——

"سچ! ہونے دو بھیا! صرف ملٹری کا کام کرنے سے بھلا کیا ہوگا۔ شہریوں کی سائیکلوں کی میں مرمت کرتا ہوں۔ کیا یہ برا ہے۔؟"

"ہوں! آج کل تو لوگ شہریوں کو بھول ہی گئے ہیں۔"

"پھر جانتے ہو نا۔" نظام نے پہیہ کھول کر نیچے رکھتے ہوئے کہا —— "میں ذرا مذہبی خیالات رکھتا ہوں۔ شراب پینا ہمارے لیے حرام ہے۔ شراب پینے والے سپاہیوں کا کام کرنا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان حرام خوروں کی نوکری ہی ہے نا؟ پھر ہمارے مذہب میں تو سود بھی نہیں لینا چاہیئے۔ اگر میرے پاس زیادہ روپے ہوں تو انہیں بنک میں رکھنا پڑے گا۔ بنک میں رکھنے پر سود بھی لینا ہی پڑے گا۔ بھلا میں یہ کام کیسے کر پاؤں گا۔؟"

باکھر ہنس پڑا —— "ہاں تم مہان دھارمک ہو۔"

باکھر نے ایک سکون سا محسوس کیا۔ بارر کے سلوک سے اسے تکلیف پہنچی تھی مگر نظام کی معصومانہ ہنسی اسے بہت اچھی لگی۔ چاہے جو ہو آخر سبھی لوگ تو اس لڑائی میں ہی کھو نہیں گئے ہیں۔ سبھی لوگ تو اس خوں ریزی کی دھارا میں نہیں بہہ رہے ہیں۔

اسے یاد آیا کہ کس طرح نظام نے تکلیفیں اٹھا کر ماموں کی دوکان میں کام

سیکھا ہے ۔ بہن کا لڑکا ہونے کی وجہ سے ہی ماموں نے نہ چاہنے کے باوجود اسے دوکان میں رکھ لیا تھا۔ غربت اور افلاس کیا ہے، یہ نظام بخوبی جانتا ہے کیوں کہ ماموں کے تھپڑ اور گالیاں کھا کر اس نے دن بتائے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ملٹری کی نوکری مستقل نہیں ہے، عارضی ہے۔ اس لیے وہ چھوٹی سی دوکان کھول کر عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

سائیکل لے کر باکھر نظام کے یہاں سے چل پڑا لیکن ذرا سا ہی آگے بڑھا تھا کہ اس پر گری کی نظر پڑ گئی۔ اس وقت وہ گھر کے سامنے ایک ملازم کو پھول کے پودوں کی جڑ صاف کرنے کی ہدایت دے رہی تھی۔ اس نے پکارا ـــــ

"کہاں چلے ہیں باکھر بھیا؟ ذرا اتر کر آئیے نا!"

وہ سائیکل سے اتر پڑا۔ گری نے تیزی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ سائیکل کو ایک جگہ لگا کر وہ گیٹ کے اندر چلا آیا اور آتے آتے بولا ـــ

"آج ہوائی اڈہ دیکھ آیا۔"

دونوں پورٹیکو سے ہو کر اندر چلے گئے۔ وہاں گری کے پتا نرکانت بروا کے ساتھ مارواڑی مہاجن، بنگالی ٹھیکیدار، بہاری مزدوروں کے ٹھیکیدار وغیرہ بہت سے لوگ اونچی آواز میں بات چیت کر رہے تھے۔ باکھر کو اندر بٹھا کر گری نے کہا ـــــ

"ان سب کی بات مت پوچھیے۔ پتاجی نے ملٹری کا کنٹریکٹ لے لیا ہے۔ چوبیس گھنٹے اسی کا ذکر رہتا ہے۔ دن بھر یہاں تک کہ آدھی رات تک یوں ہی یہ لوگ شور و غل کرتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے جہاں تک ہو سکے پورٹیکو میں، میں جاتی ہی نہیں۔"

باکھر مسکرایا۔ اچانک اس کی نظر گری کے نئے رنگ و روپ پر پڑی۔ اس نے اتنے دنوں تک دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ تندرست، گورے جسم پر کالی جارجٹ، پیروں میں جڑاؤ سینڈل، البرٹ فیشن میں شام کو بندھے ہوئے خوب صورت بال، کام کرنے کی وجہ سے کچھ الجھے سے، اس کے چہرے پر ایک عجیب رنگین مستی چھائی ہوئی تھی۔ دونوں ہونٹ ہمیشہ ہنستے ہی رہنا چاہتے ہیں۔

کان کے پیچھے پاؤڈر کا ایک ہلکا سا دھبہ انجانے میں رہ گیا ہے۔ اس کے جسم کے ارد گرد فضا میں نہ جانے کس چیز کی خوشبو تیرتی رہتی ہے۔ یہ مہک جنگلی پھولوں میں بھی نہیں ملتی۔ شام کو بہنے والی ہوا کا جھونکا بھی کسی انجانی دنیا سے ایسی خوشبو اڑا کر نہیں لا سکتا۔ مغرب کے کسی کیمیائی عمل نے اس کو جنم دیا ہے۔

دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک خوب صورت نوجوان تصویر پر باکھر کی نظر پڑی۔ اسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

پڑھنے کی میز کو یوں ہی ہلاتے ہوئے گری نے کہا ——

"آئیے باکھر بھیا! یہاں آکر بیٹھیے۔ آج آپ کو گھنٹہ بھر روکوں گی۔ بیٹھیے میں چائے منگواتی ہوں۔"

وہ نکل گئی۔ اس کے کہنے پر باکھر کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی نظر اس خط پر پڑی جس کا ایک حصہ رجسٹر سے جھانک رہا تھا۔ . . . . نہ بھولنا۔ جواب کے لیے بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا ہوں۔ پیار ! تمہارا ہی جینت۔

اس نے رجسٹر کھینچ کر خط بند کر دیا۔

چائے پینے کے بعد سونف کا ڈبہ آگے کر کے گری نے کہا ——

"ایک نیا گانا سیکھا ہے۔ سنیں گے کیا باکھر بھیا؟"

"آؤ پہلے پڑھ لو۔" اس نے کچھ تیز آواز میں کہا۔

گری نے بے بسی سے کتاب کھول لی۔ کچھ دیر بولنے کے بعد باکھر کا غصہ کم ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ گری نے بڑی خواہش سے گیت گانا چاہا تھا مگر اس نے اس طرح جواب دے کر اچھا نہیں کیا۔ اس نے صبر کے ساتھ نصف گھنٹہ اور پڑھایا پھر گری کا ہاتھ پکڑ کر کہا ——

"ٹھیک ہے بھئی، اب وہ گانا جو تم سنانا چاہتی تھیں، سنا دو۔ دھوپ میں جھلستے جسم کو ذرا سکون ملے!"

ہنستی ہوئی وہ اٹھی اور ایک کونے میں پڑی آرگن کے پاس بیٹھ گئی۔

باکھر جب جانے کے لیے باہر نکل رہا تھا تو پورٹیکو میں نرکانت بروانے اسے روک لیا۔ کہنے لگے ——

"اپنے پتاجی سے کہنا، ذرا پرانے دوستوں کو بھی یاد کر لیا کریں۔ مجھے تو

فرصت ہی نہیں ملتی۔ ملٹری کنٹریکٹ لے کر بہت جھنجھٹ میں پھنس گیا ہوں۔ چوکیرٹی میں دس بیرکیں پندرہ دن کے اندر بنا کر دینی ہیں۔ ان ٹھیکیدار کے بچوں کو لے کر سخت مشکل میں ہوں۔ ان لوگوں نے ہی سڑک بنانے والے، بانس لگانے والے، انٹ شنٹ کام کرنے والے قلیوں کو ان میں گھسیٹ کر مجھے جھنجھٹ میں ڈال دیا ہے۔ سبزی سپلائی کا کام بالکل نیچر کے ہی ہاتھوں میں سونپ دیا ہے۔ کیا کروں بھلا میں تو بالکل بے بس ہو گیا ہوں۔ اکیلے اب کام نہیں ہو رہا ہے۔ نیا مکان بنوانا بھی شروع کر دیا ہے۔ میرا نیا مکان دیکھا ہے یا نہیں تم نے؟ وہی جو تمہارے اسکول کے قریب ہی بنا ہے۔ وہ نہیں دیکھا ہے؟ جا کر دیکھ آنا۔ دو منزلہ بنوایا ہے۔ میٹریل ملنا مشکل ہو رہا ہے۔۔۔ ۔۔۔ کیا کہتے ہو لوٹ کھسوٹ بری ہے؟ نہیں، نہیں میرے جیسے لوگوں کے اور دو چار مکان کھڑے ہو جائیں تو لوٹ کھسوٹ اچھی ہو جائے گی"۔

گھر میں بیٹھا باکھران سب کی مصروفیت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فیلڈ میں مصروف سپاہی، مزدور، بدرالدین، نظام، گری اور نرکانت بروا۔ جیسے اچانک ہی کارنک کے کہر آلود دھندلکے سے نمودار ہونے والے جھٹ پٹے میں ملنے والے یہ لوگ، سروں پر دمکتے ہوئے سورج کو پا کر ہوش و حواس کھو بیٹھے ہوں۔ لوگ خوش ہیں، یہ بات اسے اچھی ہی لگی تھی لیکن اسے محسوس ہوا کہ نظام اب بھی اس کہر آلود دھندلکے میں پڑا ہے۔ پھر بھی اسے لگا، نظام ہی اچھا ہے۔ نہ جانے کیوں؟ ــــ اسے خود بھی پتہ نہیں تھا۔

جس سماج میں بھیم کا جنم ہوا ہے، اس کے ذہن پر جس سماج کی چھاپ ہے وہاں صبر کا کوئی مقام نہیں۔ اس سماج میں لوگ جسمانی طور پر کام کرنا اور اسے دونوں ہاتھوں سے خرچ کر ڈالنا ہی جانتے ہیں۔ وہاں نہ تو سوچنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کا موقع۔ حکم کی تعمیل کرنا ہی وہاں بس ایک کام ہے۔

اسی لیے چند دنوں کے اندر ہی بھیم کے ساتھ گوری کی شادی طے ہو گئی۔ ان کے اندر محبت نام کی چیز پیدا ہوئی تھی یا نہیں، اس کا انہیں علم نہیں۔ وہ تو

صرف یہی جانتے ہیں کہ جنم لینے کے بعد ایک دن شادی کرنی ہی پڑتی ہے۔ نہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ کم از کم وہ اب تک یہی دیکھتے آئے ہیں اور انہیں جسمانی بھوک کا بھی علم ہے کسی طرح دو دل پاس آ جائیں تو ان کے لیے پھر راہِ فرار نہیں۔ بیٹے بیٹیوں کے تجربہ کار والدین جانتے ہیں کہ بیٹے بیٹی مل جائیں تو شادی بھی کر دینی چاہیئے۔ یہ تو ان کے پرکھوں کا دھرم ہے۔

دھرم اکثر سماجی روایات کا محافظ بھی بن جاتا ہے۔

شادی کرنے کے بعد بھی تو بھیم کو شاکیہ کے یہاں ہی رہنا ہے۔ اسی وجہ سے شاکیہ نے رسوئی گھر کے قریب جلدی میں پھونس کا مکان بنوا دیا۔ باکھر نے پوچھا بھی تھا ـــــ "بھلا تو اپنے گھر میں کیوں نہیں رہتا؟"

"اوہ پوچھو مت" بھیم نے کہا ـــــ "قلی لائن میں رہنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ دن رات شور شرابہ، لڑائی دنگا، شراب پی کر شور مچانا بس یہی سب۔"

باکھر نے ہنس کر پوچھا ـــــ

"تیرے ماں باپ کیا کہتے ہیں؟"

"وہ بھلا کیا کہیں گے؟ کچھ بھی نہیں کہتے۔ کیا وہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں؟" بھیم نے فخر سے جواب دیا۔

"مگر شادی کا انتظام کن لوگوں نے کیا"؟

شرم کے مارے بھیم نے سر جھکا لیا۔ پھر دھیرے سے کہا ـــــ

"تم شور نہ کرو بھیا، بابو جی سن لیں گے ـــــ میں آج رات تمہیں ساری باتیں بتا دوں گا۔"

اس رات بھیم نے باکھر کے کمرے میں اپنی محبت کی روداد سنائی تھی۔

حسبِ معمول اس روز بھی بھیم لائن میں گوری سے ملنے گیا تھا۔ شام کا وقت تھا اور اس رات باکھر وغیرہ کی کہیں دعوت تھی اس لئے اسے کھانا پکانے سے فرصت مل گئی تھی۔

سنیچر کا دن تھا۔ لائن میں رات کی تیاری کی وجہ سے مصروفیت تھی۔ کہیں تو شراب کی محفل جم چکی تھی، کہیں جوا کھیلنے کا اڈہ جم رہا تھا اور کہیں نوجوان لڑکوں کا جمگھٹ ہو رہا تھا۔ ہر گھر میں بہو بیٹیاں رسوئی بنانے میں مصروف

تھیں، کہیں چھوٹے بچے ابتدائی درجے کی کتابیں پڑھ رہے تھے ـــــ کیا کب، ہا وینی، ترٖ بر، چلی کنی۔ بھیم ایک کٹورہ ٹھنڈا پانی پی کر جسم پر ایک چادر ڈال کر لائن میں گھومنے نکل پڑا تھا گوری کے گھر کے قریب ہی ایک آدمی بیڑی دیاسلائی بیچا کرتا تھا۔ بھیم بیڑی لینے کے بہانے وہاں گیا اور کچھ اونچی آواز میں بیڑی والے سے ایک بنڈل دینے کو کہا۔ مقصد یہ تھا کہ اس کی آواز گوری کے کانوں تک پہنچ جائے اور وہ باہر آجائے۔ بیڑی لے کر وہ دوکاندار سے یوں ہی کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد قریب ہی میں کھڑا ہو کر اس کا انتظار کرتا رہا۔ تبھی گوری کٹورے کا پانی پھینکنے کے بہانے باہر آگئی۔ اس کے پاس جاکر پھس پھساتے ہوئے کہا ـــــ

"تیرا بابا ہے کیا ؟"

"نہیں ہے۔" اس نے بھی دبی آواز میں کہا۔

"بودھن کے یہاں آئے گی کیا ابھی ؟"

"ٹھیک ہے، کوشش کروں گی۔"

"نہیں، نہیں، ضرور آنا۔ میں وہیں رہوں گا۔"

دور بکل کی آواز سنائی دی۔ وہ باہر سے ہی کسی کو چیخ کر پکار رہا تھا ـــ

"او بیٹا رام داس! ہے کیا ؟" یعنی شراب ہے کیا ؟

بھیم بولا ـــــ

"جا جا۔ میں چل رہا ہوں۔ مگر تو آجانا، ہاں" کہتے ہی وہ کسی جانب اوجھل ہو گیا۔

گوری کے تن بدن میں اس وقت جذبات کی گرمی تھی۔ باپ کی آواز سن کر وہ بھیم کی طرح ڈری نہیں بلکہ بھیم نے جلدی جلدی جو صلاح اسے دی تھی اس سے اس کے دل میں جذبات کی مستی بھر گئی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح جھٹ پٹ رسوئی بنا کر منی کے یہاں پہنچ جائے۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ سماج کے بندھنوں، مذہبی اور خاندانی روایات، ماں باپ اور اپنی لاج شرم تک کو بھول گئی۔ اسے صرف اتنا ہی یاد رہا کہ گھر سے نکل کر بھیم سے ملنا ہے۔

اندھیرے کے دریچے سے پرے بھیم اور گوری، منی کے چبوترے پر بیٹھے ہوئے پیار و محبت کی باتیں کر رہے تھے۔ منی اندر تھی، منگرا گھر میں نہیں تھا — دریودھن بیڑی لانے گیا تھا۔ اچانک بکل آ نکلا۔ اس نے منگرا کو پکار کر ہاتھ میں تھامی ہوئی ٹارچ جلائی تو بھیم اور اس کے سینے سے لگی گوری روشنی کی گرفت میں آ گئے۔ گوری فوراً اٹھ کر اندر بھاگ گئی۔ خطرہ محسوس کر کے بھیم فوراً کھڑا ہو گیا۔

"کون ہے تو"؟ بکل نے کڑک کر پوچھا۔

"میں ہوں"!

"تو کون"؟

"بھیم"!

خاموش محبت کا راز فاش ہو گیا۔ اس نے آواز دے کر بیٹی کو ڈھونڈ نکالا۔ پہلے ہی اس کے کانوں میں کچھ بھنک پڑ چکی تھی مگر اس نے اس بات پر کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن آج جب خود اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا تو اس کا خون کھولنے لگا۔ وہ چیخ اٹھا —

"سالا، بے ایمان۔ تیرے یہ کرتوت۔ سالے تیری یہ ہمت ؟ تو میری بیٹی کے پیچھے پڑا ہے۔ تو بکل کو پہچانتا نہیں ؟ تیرا خون پی جاؤں گا۔ تجھے کچا چبا ڈالوں گا۔"

ٹارچ لیے وہ بھیم پر جھپٹا۔ دونوں لڑکیاں گھر کے کونے میں دبکی کانپ رہی تھیں۔ بھیم سمجھانے کے لیے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بکل آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ وہ بھیم کو مارنے پر تلا تھا۔ اس کی دودھ کی دھوئی بیٹی کی بے عزتی کرتا ہے، کتا۔ بھلا وہ اسے کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

اسی دوران دریودھن 'کاکا۔ کاکا' کہتا ہوا آیا اور بکل کو پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر بعد منگرا بھی وہاں آ گیا۔ پاس پڑوس کے لوگ بھی وہاں آ کر جمع ہو گئے۔ بکل کو پکڑ کر رکھنا بھی مشکل تھا۔ وہ دریودھن کے مضبوط بازوؤں سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرتا ہوا چیخ رہا تھا —

"چھوڑ، چھوڑ یودھن، مجھے چھوڑ دے! میں اسے دیکھ لوں گا۔ سالا بدذات

کہیں کا۔ میری بیٹی کے پیچھے پڑا ہے۔ تیرا خون پی جاؤں گا۔ تجھے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ مجھے پہچانتا نہیں۔"

دھیرے دھیرے پوری بات لوگوں کی سمجھ میں آ گئی۔ ان لوگوں کے درمیان بھی موضوع زیر بحث تھا۔ بکل کے اس ہنگامے نے یہ بات پھیلادی۔

بھیم شرم سے سر جھکا کر ایک جانب کھڑا رہا۔

"کیا شور و غل مچا رہے ہو تم لوگ"؟ چوکیدار نے نزدیک آکر دریافت کیا۔

" بتاؤ کیا ہوا ہے؟ اتنا ہنگامہ کیوں مچا رکھا ہے۔؟"

بھیڑ میں سے کوئی بول اٹھا ـــــــ

" بکل کی بیٹی کے ساتھ بھیم یہیں اندھیرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ بکل نے دیکھ لیا اور اسے غصہ آ گیا۔"

بکل نے چیختے ہوئے کہا ـــــــ

" تم ٹھیک ٹھیک پتہ کر لو چوکیدار۔ میں سویرے ہی بڑے صاحب کے پاس مقدمہ کر دوں گا۔ تم خبر دے دینا۔ اس سالے کو بھی خبر دے دو آفس جانے کے لیے۔"

دھیرے دھیرے بھیڑ چھٹ گئی۔ چوکیدار چلا گیا۔ منی گوری کو کہیں ہٹا لے گئی۔ بھیم وہاں سے کھسک گیا۔ کیرتن گھر کے ایک تاریک گوشے میں وہ اکیلا خاموش بیٹھا رہا۔ منگرا اور دریودھن نے بکل کو لے جا کر اندر بٹھایا۔ ماں کی بیماری بڑھ جانے کے باعث وہ اسپتال میں تھی۔ پل بھر میں دریودھن کہیں سے ایک گھڑا شراب لے آیا۔ زندہ 'گرئی' مچھلیاں تھیں۔ ان میں سے بڑی بڑی چار پانچ مچھلیاں چن کر آگ میں بھونی اور نمک مرچ لگا کر بکل کے سامنے رکھ دیں۔

کافی دنوں سے گھر کے کونے میں رکھ کر سرد کی ہوئی شراب حلق سے اترتے ہی بکل کا غصہ بھی سرد ہونے لگا۔ موقع غنیمت جان کر منگرا نے بکل سے بھیم اور گوری کی شادی کی بات چھیڑی۔ ایک چھوٹی سی بحث ہوئی۔ آخر میں بکل بولا:

"اچھا، دیکھا جائے گا۔"

"نہیں بھائی، شادی کر دو! بھیم برا لڑکا نہیں۔"

"کیا جانوں!"

"ارے اس کا جیسا لڑکا اور نہیں ملے گا۔ شراب نہیں پیتا، برا کام نہیں کرتا۔ کیرتن کرتا ہے۔ رات کو معمول کے مطابق پہرہ دیتا ہے۔ بابو کے گھر میں لکھنا پڑھنا سیکھتا ہے۔ اس کا جیسا داماد کہاں ملے گا رے؟ جوان لڑکا ٹھہرا۔ ذرا دل بہلاؤ کر ہی لیا تو کیا ہوا؟ کیا تو بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ کبھی کوئی برا کام نہیں کیا تھا؟"

بکل کو کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے۔ پھر کل شادی بھی کر لیں گے۔"

مار دی بازی۔

دریودھن نے اسی وقت چوکیدار کو بتا دیا کہ مقدمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر گوری اور منی کو خبر دے کر کافی تلاش کے بعد کیرتن گھر کے کونے سے بھیم کو بھی کھینچ لایا۔

اس کے بعد ایک اتوار کو ان کی شادی ہو گئی۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ شاکیہ کے یہاں ہی رہنے لگا۔ گوری اب اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اس کی مددگار بن گئی۔ وہ چائے باگان میں مزدوری کرتی تھی۔ کارخانے کے 'سرٹنگ روم' میں کام کرتی اسی وجہ سے صرف صبح و شام کو چھوٹے موٹے کاموں میں ہی شوہر کا ہاتھ بٹا پاتی تھی۔

ڈھلتی عمر والے بوڑھے شاکیہ کے سوکھے چہرے پر کافی دنوں بعد ہنسی نظر آئی۔ گھر آتے جاتے وہ گوری کے ساتھ گپیں لڑا کر ہنسی مذاق کرنے لگے۔ بڈھے جب اس کے ساتھ گپیں لڑاتے تو گھر کے کئی حصوں میں جیسے کسی پوشیدہ ہنسی کا چشمہ سا ابل پڑتا۔

وجودِ زن کا یہ معجزہ ہے، اس کی موجودگی کا یہ کرشمہ ہے۔ ماں ہو، بہن ہو، بیوی ہو، محبوبہ ہو۔ عورت کی یہی ساری شکلیں تصویرِ کائنات میں رنگ بھرتی ہیں۔ اس کے لمس سے خشک درخت لہلہا اٹھتے ہیں۔ اس کو چھو کر آنے والی ہوائیں عطر بیز ہوتی ہیں۔ اس کے اثر سے مردہ انسان میں بھی زندگی کی رمق آجاتی ہے۔

شاکیہ کے خشک ذہن میں خوشی کا ایک چشمہ ضرور پھوٹا تھا لیکن ان کے لاشعور میں ایک درد کا احساس جاگ اٹھا تھا —— ایک خواہش۔ گوری

کی موجودگی نے ان کے ذہن میں اپنی بہو کی خواہش بیدار کر دی تھی جو ان کا زیادہ خیال کر سکے گی۔ انوپما ان کے سونے گھر کو آکر جگمگا دے گی۔ اس کے آنے سے گھر میں زندگی آجائے گی۔

انھوں نے گرین سے چپ چاپ مشورہ کر کے باکھر کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"گریلا، سوچ رہا ہوں کہ باکھر کی شادی کر دوں۔"

"بڑا اچھا خیال ہے پھوپھا جی!"

"ہاں اس ویران گھر میں مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس جائے بگان کی نوکری میں تو عمر گذر گئی لیکن اب تو زمین میں ہاتھ لگانا ضروری ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے میں لڑکے کی زندگی کو ایک راستے پر لگا دینا چاہتا ہوں۔ شادی ہو جانے پر اس میں ذمے داری کا احساس پیدا ہو جائے گا اور وہ خود ہی مناسب راستہ اختیار کرے گا۔ پھر تمام فکروں سے آزاد ہو جاؤں گا۔"

باکھر جانتا تھا کہ پتا جی اس کی شادی کے بارے میں فکر مند ہیں۔ اسی درمیان گرین نے جب اس کے سامنے شادی کی تجویز رکھی تو اسے تعجب نہیں ہوا۔ وہ کچھ فکر مند ضرور ہو گیا تھا کیوں کہ اچانک اس نے خود پر ذمے داری کا بوجھ محسوس کیا تھا۔

گرین بولا ــــــ

"پھوپھا کو اب زیادہ دکھ نہ دینا بھیا۔ بہو سے خدمت کرانے کی خواہش بوڑھے آدمی کے دل میں پیدا ہونا فطری بات ہے۔ پھر تمہیں بھی تو شادی کرنی ہی ہے۔ انہیں اس عمر میں راحت دینا تمہارا بھی فرض ہے۔"

باکھر صرف سوچتا رہا۔ کچھ جواب نہیں دے سکا۔

گرین ہمیشہ تقاضے کرتا رہا۔

شاکیہ بے حد خاموش رہتے۔ باپ بیٹے کے درمیان بات چیت بند سی ہو گئی تھی۔ گرین فکر مند ہو گیا۔ بیچاری گوری باکھر کی منت سماجت کرنے لگی۔

باکھر رات کی تنہائی میں انوپما کے خط نکال کر پڑھا کرتا۔

"آپ کی ؟ شری انوپما :

"آپ کی انوپما"
"آپ کی ہی کنکی!"
ایک دن باکھر بولا ـــــ
"گرین، پتا جی سے کہنا مجھے ان کے فیصلے سے اختلاف نہیں ہے۔"
شاکیہ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بھیم کو اپنا جسم ہلکا سا لگا۔
گرین بے حد مصروف ہو گیا۔ شادی کی ساری ذمے داری اسی پر آ پڑی۔ وہ ہنسی خوشی کام میں مصروف ہو گیا۔
باکھر کی شادی بخوبی انجام پا گئی۔
جلد بازی میں ہونے کے باوجود تقریب بے حد پرکشش تھی۔ جنگ کے اس مہنگے بازار میں شاکیہ نے اتنی بڑی تقریب کا اہتمام کیسے کیا، لوگ اس پر حیرت زدہ تھے۔ بازار میں نمک عنقا تھا۔ سرسوں کے تیل کی قیمتیں آسمان چھو رہی تھیں، کراسن پر کنٹرول تھا۔ چینی تو دوا کے لیے بھی ملنی مشکل ہو گئی تھی۔ پھر بھی باکھر کی شادی میں لوگ پوری، ترکاری، مٹھائی اور دہی کے وسیع انتظامات دیکھ کر حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لوگوں نے یہ بات دل ہی دل میں تسلیم کر لی کہ خیر جان چائے بگان کے بڑے کرانی کے پاس دولت، عزت، اور جائداد سب کچھ ہے۔ دو روز کی تقریب کے دوران تو خیر جان بگان میں دُرگا پوجا کی طرح چہل پہل تھی۔ چھوٹے سے شہر ڈُمڈُما میں بھی اسامی لوگوں کے درمیان باکھر کی شادی موضوع بحث بن گئی۔
ڈیوڈ اور جیمی دونوں ہی ایک جیپ میں چوکیرٹی سے آئے تھے۔ وہ شروع سے آخر تک شادی کی تقریبات دیکھتے رہے۔ وہ لڑکے لڑکیوں کو اپنی جیپ پر بٹھا کر بارات کے ساتھ گئے تھے۔
"باکھر میں تمہاری شادی بہت شوق اور دلچسپی سے دیکھوں گا کیونکہ شاید پھر مجھے ہندوستانی شادی کی رسومات دیکھنے کو نہ ملیں" ـــــ ڈیوڈ نے کہا تھا۔
"ضرور آنا ڈیوی۔"
"اور ہاں ایک بات۔ میرے ساتھ ایک ایسا آدمی کر دینا جو مجھے ساری

باتیں بتا تا رہے۔"

"ٹھیک ہے تم فکر نہ کرنا۔"

"پھر تم لوگوں کی شادی میں ہم جیسے مدعوئین کو کیا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی سمجھا دینا۔"

گری اور رینو آ ئی تھیں۔ تحفہ بغل میں چھپاتے ہوئے گری نے کہا تھا۔۔۔

"باکھر بھیا! میں تو آپ کی ہی گاڑی میں بیٹھوں گی۔ دلہن کے پاس بیٹھے بغیر میں مانوں گی نہیں۔"

"مگر میں بھلا تمہیں دلہن کے پاس بیٹھنے ہی کیوں دوں گا؟"

"ٹھیک ہے تو میں آپ کے پاس بیٹھوں گی۔"

"میرے پاس تو رہے گی دلہن۔"

"ٹھیک ہے، دیکھا جائے گا۔ تب تو میں دلہن کے گھر والوں کو آپ کے خلاف دیاگیت (شادی کے موقع پر گایا جانے والا مزاحیہ گیت) گانے کا اشارہ کر دوں گی۔ آپ کو مزہ چکھاؤں گی۔ آپ دیکھتے رہیے گا ذرا۔"

کافی دنوں بعد نرکانت برداشا کیہ سے ملنے آئے تو گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔۔۔

بدرالدین آیا تھا۔ قیمتی کپڑے کی کریز دار لمبی پینٹ، سر پر فیلٹ ہیٹ، منہ میں سگریٹ، ہاتھ میں ایک قیمتی تحفہ۔ منڈپ میں دھواں اڑاتا ہوا بے حد خاموش اور سنجیدہ، تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ کسی کی آمد پر ترچھی نظر ڈال لیتا۔ جوان عورت کے آنے پر وہ نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں تھا۔

اس نے کہا۔۔۔

"باکھر! بارات میں چلنے کی بہت خواہش تھی لیکن کیا کروں، جانتے ہی ہو تاجر پیشہ ٹھہرا۔ کسی طرح بھی جا نہ پاؤں گا۔ تم بُرا نہ ماننا اور کبھی آ کر تمہاری والف کے ہاتھ کی ایک کپ چائے پی جاؤں گا۔ اب چل رہا ہوں۔"

گویا باکھر بدر کے ہی رحم و کرم پر ٹکا ہوا ہے۔

گرین کے پیروں میں چرخی لگی ہوئی تھی۔ وہ ہمہ تن مصروف تھا۔ کبھی اندر جا رہا ہے کبھی باہر آ رہا ہے، کبھی یہ لا رہا ہے کبھی وہ لا رہا ہے۔ لوگ اسے

حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ سچ پوچھیے تو سامان کی فراہمی سے لے کر شادی کی تمام تر تیاریاں اس نے تنہا ہی کی تھیں۔ وہ اگر نہ ہوتا تو بوڑھے شاکیہ شادی کی تیاری اتنے شاندار پیمانے پر کر ہی نہیں سکتے تھے لیکن یہی کار اگر وہ چپ چاپ آہستگی سے کرتا تو لوگوں کی نظروں میں نہ آتا۔

دریودھن، منی، منگرا اور بکل تو دو دنوں کے لیے بھیم کے یہاں ہی آکر جم گئے تھے۔ دن رات بس پانی لانے، لکڑی لانے اور برتن دھونے میں مصروف رہتے۔ انہیں نہ فرصت تھی اور نہ ہی وہ آرام کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے تقریب کی تفریحات میں بھی کوئی دل چسپی نہیں لی۔ بس انہیں تو کام سے کام تھا۔

ڈیوڈ نے کہا تھا ـــــــ

"باکھر! میں محسوس کرتا ہوں، تم لوگوں کی شادی تو ایک بڑی تجارت ہے"۔

باکھر کے دل میں ایک خوف سا تھا کہ انوپما کی شکل میں اسے مایوسی نہ ہاتھ آئے لیکن اس خوف کے دور ہونے میں دیر نہ لگی۔ انوپما پڑھی لکھی تو تھی ہی، اس کے ساتھ ہی ایک کامیاب اور سگھڑ گرہستن بھی تھی۔

صبح ہی صبح سسر سے کہتی ـــــــ

"پتاجی، آپ کو چائے دے دوں؟"

ناشتہ بنا کر وہ باکھر سے کہتی ـــــ

"نہا لیجیے نا، نو بج گئے ہیں"۔

بھیم کو پکارتی ـــــــ

"بھیم آ چائے پی لے۔ کیا صرف باڑی ہی میں لگا رہے گا؟ چائے پی کر مجھے ایک صابن لا دینا"۔

ایک دن باکھر نے آکر کہا ـــــــ

"کل ڈیوڈ یہاں آکر ہماری تصویر اتارنا چاہتا ہے"۔

"کیا کرے گا بھلا وہ؟"

"کہتا ہے، امریکہ بھیجے گا۔ ڈیوڈ اپنی بہن کے نام خط میں ہمارے متعلق لکھ بھی چکا ہے۔ وہ آدمی بھی اپنے رنگ کا بس ایک ہی ہے۔ اپنی ماں اور کیرولین کے خط مجھے ہمیشہ دکھایا کرتا ہے۔ خاص کر اس میں میرے متعلق لکھی ہوئی باتیں۔

بتی بجھ جاتی ہے۔

کھلی کھڑکی سے جھانک کر باکھر بیٹھ گیا۔ انوپما کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ جذبات میں انوپما نے خود کو شوہر کی آغوش میں ڈال دیا۔ باکھر نے پکارا۔

"گگی!"

"اوں!"

"ایک بات کہوں؟"

"ایک کیوں؟ کہتے رہیے جتنی ہو سکیں!"

"میں کچھ سوچا کرتا تھا"

"کس کے بارے میں؟"

"تمہارے"

"جیسے؟"

"تمہارے بارے میں میرا وہم تھا۔ میں سوچتا تھا کہ تمہارے اندر شاید کچھ دوسرے ہی ڈھنگ کی لڑکی ہے"

"مگر؟"

"اب تو دیکھتا ہوں کہ تم، تم ہی ہو"۔

"آپ کو مایوس تو نہیں ہونا پڑا نا؟"

"مایوس؟ اب سوچتا ہوں کہ تمہیں پانا میری خوش قسمتی تھی یا کچھ اور"

"کیا میں اتنی ہی اچھی ہوں؟"

"شاید اس سے بھی زیادہ"

"مگر مجھے تو ڈر لگتا ہے"

"کیوں؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"میں بہت اچھی ہوں، کہیں اسی بھرم میں بالکل بری نہ ہو جاؤں"

" ایک خوب صورت گیت ہمیشہ خوب صورت ہی رہتا ہے "

" مگر اس کے پرانے ہو جانے پر سننے کی خواہش نہیں ہوتی "

" لیکن گیت تو گیت ہی رہتا ہے "

" گیت کی قیمت اس وقت تک ہے جب تک وہ کتاب کے اوراق پر رہتا ہے اور کتاب آنکھوں کے سامنے کھلی رہتی ہے "

" لیکن کتاب بند کرنے کے باوجود بھی گیت کا اثر پڑھنے والے کے ذہن میں جادو جگاتا رہتا ہے اور اس کا اثر ختم نہیں ہو پاتا "

" پھر بھی لوگ گیت تو ہمیشہ نہیں پڑھتے "

" کیوں کہ لوگ شاعری کی عظمت کو نہیں پہچانتے "

دوسرے دن ڈیوڈ آیا تھا۔

اس کے اگلے دن گری اور رینو آئے۔ باکھر سے کافی شوخ ہونے کے باوجود رینو استاد ہونے کی حیثیت سے اس کی بہت عزت کرتی تھی اسی لیے اس سے سر اٹھا کر بات بھی نہ کر سکی۔ گری بالا نے تو تھوڑی ہی دیر میں 'نئی بہو' سے دوستی بھی کر لی۔ اور تو اور دوسرے دن ڈنڈما آنے کے لیے بہو کو دعوت بھی دے دی۔ رینو کو ایک ننھی سی کتاب انعام میں ملی۔

دوسرے دن باکھر اور انوپما ڈنڈما ہو آئے۔

گری اور انوپما میں دوستی گہری ہو گئی۔ گری اکثر موٹر سے آتی اور انوپما کو گھمانے کے لیے ڈبرو گڑھ، تنی چکیا وغیرہ مقامات پر لے جاتی۔ کبھی کبھی باکھر ساتھ نہ جا پاتا تو شاکیہ جایا کرتے۔ باکھر کے معذوری ظاہر کرنے کے باوجود شوخ گری کا ادھم کم نہ ہوتا۔ وہ شاکیہ کو جا پکڑتی ——

" چاچا جی، چلیے آج آپ کو ہی چلنا ہوگا "

" کہاں ؟ "

" ڈبرو گڈھ "

رام، رام۔ کیا اس بڈھے کو مارنا چاہتی ہو ؟

" یہ نہیں ہو سکتا۔ بڑھاپے کا بہانہ کر کے آپ بچ نہیں سکتے۔ آج ڈبرو گڈھ

ہیں ایک ورائٹی شو ہونے والا ہے۔ ہمیں وہاں جانا ہی ہے۔ رینو اور میرا گانا بھی ہوگا۔ آپ چلیے۔ رات کو آٹھ بجے تک واپس آجائیں گے۔"

شاکیہ لاچار ہو جاتے۔ اندر انوپما ساڑی کا کونہ منہ میں دبا کر ہنسا کرتی۔ رینو اس معنی خیز ہنسی کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتی۔ کچھ دیر بعد موٹر کی اگلی سیٹ پر شاکیہ اور رینو اور پچھلی سیٹ پر گری اور انوپما بیٹھ کر روانہ ہو جاتے۔ کہیں سے واپس آنے پر باکھر کو گھر اندھیرا ہی ملتا۔ وہ ذرا سا مسکرا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ انوپما اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے، یہ بات اسے ناگوار نہیں گذرتی تھی بلکہ اسے خوشی ہی ہوتی کیوں کہ وہ انوپما کے کسی شوق میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا تھا۔ اگر اس کی خواہش لڑکیوں میں جانے کی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے۔ کیا وہ باکھر کے لیے گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے؟ پھر اسکول کے کاموں میں الجھ کر باکھر کو فرصت بھی بالکل نہیں مل پاتی۔ کسی طرح سے اسکول کو زندہ رکھنے کے لیے اسے بہت محنت کرنی پڑ رہی ہے۔

رسوئی سے ایک کپ چائے بنا کر گوری اسے دے جاتی تھی۔

بہو سے شاکیہ کا لگاؤ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ انوپما کی شکل میں انہیں ایک ایسی شخصیت مل گئی تھی جس کی کمی وہ بیوی کی موت اور بیٹی کی دور شادی ہو جانے کے بعد سے مسلسل محسوس کرتے آئے تھے۔ انہیں بہو کی بے تکلف ادائیں بے حد پسند تھیں۔ دوسری بہوؤں کی طرح انوپما ہاتھ بھر لمبا گھونگھٹ ڈالے سسر کو دیکھتے ہی اوٹ میں نہیں چلی جاتی تھی۔ سسر کے سامنے آکر کام کرنے کے ساتھ ساتھ بات چیت بھی کرتی جاتی۔ بہو کی باتیں بھی ان کے دل میں گھر کر جاتیں۔ انوپما اگر کہتی —— "بابوجی! ان تتابا ہک' پودوں کو قلم کر دینا کیا اچھا نہیں رہے گا؟" تو دوسرے ہی دن دو آدمی آکر ان تتابا ہک پودوں کی کاٹ چھانٹ میں لگ جاتے۔ اگر انوپما کہتی —— "بابوجی! کل لائے گئے کپڑوں سے کیا دو رومال بنا دوں؟ آپ کے پاس تو رومال ہی نہیں ہیں"۔— تو شاکیہ کو خیال آتا، ٹھیک ہی تو ہے ان کے دو رومال کب کے پرانے ہو چکے ہیں۔

دو باتیں باکھر کو پسند نہیں آئیں۔

پہلی ——— دریودھن اتنے دنوں چائے بگان میں کام کرنے کے بعد فیلڈ میں کام کرنے چلا گیا۔ بھیم نے اسے یہ خبر دے کر کہا———

"میں نے اسے سمجھایا تھا بھیا! مگر اس نے ایک نہ مانی۔ دوسروں کو کافی پیسہ کماتے دیکھ کر اس کے دل میں بھی لالچ نے گھر کر لیا۔"

دوسری ——— سننے میں آیا ہے کہ گرین نوکری چھوڑ کر ٹھیکے کا کام کرنے والا ہے۔ الوپما نے ایک دن بتایا کہ وہ پتا جی سے کہہ رہا تھا کہ اگر اس موقع پر ٹھیکے کا کام نہیں کرتا تو آگے لوگ ہنسیں گے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ پتا جی کو اسے کچھ روپے پیسے دے کر مدد کرنی ہوگی۔

باکھر کو برا لگا! جنگ اور پیسوں کی یہ کشش اسے پسند نہیں ورنہ وہ خود ہی ٹھیکے کا کام لے کر لاکھوں روپے کما سکتا تھا۔ اس کو یقین ہے کہ جنگ کی یہ جھوٹی کشش لوگوں کو اندر سے توڑ دے گی۔ زندگی میں نہ خوشی آنے دے گی اور نہ سکون۔ اس کے علاوہ زندگی میں جن کاموں کو وہ آدرش مانتا رہا ہے ان کی بے حرمتی دیکھ کر اس کے دل کا سکون غارت ہو گیا۔

اندھیرے میں اکیلا بیٹھا ہوا وہ سوچا کرتا، اس جنگ نے دنیا میں ہلچل مچا دی ہے۔ صرف باہر ہی یہ ہلچل نہیں مچی ہے۔ آدمی کو اندر تک اس نے جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ لوگ پہلے جیسے محنت مزدوری کر کے قناعت کرنے والے نہیں رہے۔ سبھی بے پرواہ سے ہو گئے ہیں۔ دو چار روپوں کا لالچ ——— کچھ سکوں کی کھنکھناہٹ ——— اسی کو لے کر وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ اب یہ ان سے منہ موڑ سکیں گے۔ یودھن کیا پھر اسکول جا سکے گا؟ دریودھن کیا اپنی ماں بہنوں کی عزت بچانے کے لیے ہتھیار اٹھا سکے گا؟ دنیا میں پھر سکون قائم ہو سکے گا؟ اسے شک تھا۔

اپنے دل کی باتیں وہ کبھی کبھی الوپما سے کہا کرتا۔ وہ پوچھتی ———

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ جنگ نہ ہو؟"

"دیکھو لکی، عام طور پر آدمی جنگ نہیں چاہتا، امن ہی چاہتا ہے اور

امن کا مطلب ہی ہے جنگ کا خاتمہ۔ لیکن میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ کبھی کبھی اس امن کی ہی خاطر جنگ چھڑ جاتی ہے۔ پھر بھی ہمیں کہنا ہوگا کہ ہم جنگ نہیں، امن چاہتے ہیں۔ لیکن کل اس جنگ کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک کے ان لوگوں کا دل ٹوٹ گیا ہے اس کا کفارہ کون ادا کرے گا؟ ہمارا سماج جو شکست و ریخت کا شکار ہے اس کی از سرِ نو تعمیر کون کرے گا؟ آج مزدور صرف آٹھ آنے کا کام کر کے دھوکے بازی سے ایک روپیہ کما لیتا ہے، چھوٹے چھوٹے ٹھیکیدار سپاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہزاروں روپے لوٹ رہے ہیں۔ چائے بگان کے محرر ہوائی اڈے میں مزدور بھجوا کر ہر دن پچاس ساٹھ روپے کما رہے ہیں، کیا ایسے لوگ آئندہ سدھر سکتے ہیں؟"

الوپما کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ جاتی۔

اس کے یہ خیالات دل ہی دل میں الوپما پسند نہیں کرتی۔ جب دنیا کے تمام لوگ ایک ہی رو میں بہے جا رہے ہیں تو سب غلط کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنے باپ کو دولت کماتے اس نے بچپن سے ہی دیکھا ہے۔ آج بھی ملٹری کے ٹھیکے کا کاروبار کر کے وہ کافی دولت کما رہے ہیں۔ اس لیے باکھر بھی اگر ٹھیکے کا کام کرتا تو وہ بھی عیش کرتی۔ اگر کروکشیتر میں بھگوان کے منہ سے گیتا نکل سکتی ہے تو پھر اس چوکیرٹی چائے بگان میں پھر سے کوئی ارجن نکل آئے۔ بھلا اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کبھی کبھی اس طرح بحث کرنے کی اس کی خواہش رہتی تھی پر باکھر کے سامنے یہ ساری باتیں کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ جب کہ اسے پتہ بھی تھا کہ یہ باتیں اسے پسند نہیں۔ پھر بھلا وہ ایسا کام کیوں کرے۔

پھر بھی باکھر دل ہی دل میں تسلیم کرتا کہ اس جنگ کی ضرورت ہے۔ صرف بے رحم اور جنگ پسندوں کے ہاتھوں میں اس دنیا کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اس سے امن و امان درہم برہم ہونے کے سوا اور کیا ہوگا۔ ہٹلر کو یورپ پر قبضہ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینے کا مطلب ہے تہذیب کو قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دینا۔ وطن سے نکالے گئے بے وطن یہودیوں پر من مانی کرنے کی اجازت دیدینے کا نام تہذیب نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف مشرق کی رہنمائی کرنے کے لیے جاپان

آگے آگیا ہے جو پورے ایشیا کے اتحاد کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ صرف غیر ملکی ہونے کے باعث کسی بے قصور انسان کو ننگا کر کے پیٹنا اگر تہذیب ہے تو پھر بربریت کسے کہا جائے گا۔ نئی زندگی حاصل کرنے کے باوجود بھی تو چین اب تک امن کے ذائقے سے آشنا نہیں ہو سکا ہے۔ چین بھلا آخر جاپان کو برداشت ہی کیوں کرے۔ طاقت کے نشے میں چور ہو کر نہایت دیدہ دلیری سے جاپان نے نان کنگ کی راہ میں چین کی ماؤں کی بے حرمتی کی ہے۔ سنگینوں کی نوک سے معصوم بچوں کے جسموں کو چھید کر لطف حاصل کیا ہے۔

باکھر کا ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔

جنگ چاہیے۔ ان ظالموں کو بندوق کی سنگینوں کا مزا چکھانے کے لیے جنگ کی ضرورت ہے۔ کانٹے سے کانٹا نکالے بغیر چارہ ہی کیا ہے۔ لیکن شکستہ دل لے کر بھلا لوگ دنیا میں چین سے کیسے زندگی گذار سکیں گے۔ اس بیں سے بھلا کون سی راہ درست ہے۔ اس کے ذہن کی کشمکش کا اظہار اس کے افعال سے بھی ہوا تھا۔

الوپما دیکھتی کہ وہ کافی کوشش کے بعد ہی ہنس پاتا ہے۔ شاکیہ دیکھیے! وہ گھر سے نکلتا ہی نہیں۔ ایک دن ڈیوڈ نے کہا ——

"باکھر، تمہیں کچھ ہو گیا ہے؟ آج کل تم کافی فکرمند رہا کرتے ہو؟"

وہ زبردستی کی ہنسی ہنس کر کہتا ——

"کچھ بھی تو نہیں ہوا ڈیوی۔ یوں ہی کبھی کبھی جی اچھا نہیں لگتا۔ بھلا یونہی کبھی کبھی تمہارا بھی جی اچاٹ نہیں ہو جاتا کیا"؟

یا کگی سے کچھ ہوا ہے"؟

"نہیں، نہیں، یہ سب کچھ بھی نہیں"۔ ڈیوڈ کو بے اختیار ہنسی آجاتی کگی، اس کا تعلق کتنا گہرا ہے۔ کگیؔ سے کتنی اپنائیت ہے۔ وہ تو دکگی کی شخصیت کا ایک جزو بن گیا ہے یہ بات ڈیوڈ کو کیا معلوم؟

کھلے دل سے ہی ایک دن ڈیوڈ نے الوپما سے پوچھا ——

"کگیؔ بتا سکتی ہو کہ باکھر یوں دن بدن کیوں چپ ہوتا جا رہا ہے۔؟"

باکھر پاس ہی تھا۔ بول اٹھا ——

امن کا مطلب ہی ہے جنگ کا خاتمہ۔ لیکن میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ کبھی کبھی اس امن کی ہی خاطر جنگ چھڑ جاتی ہے۔ پھر بھی ہمیں کہنا ہوگا کہ ہم جنگ نہیں، امن چاہتے ہیں۔ لیکن کی اس جنگ کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک کے ان لوگوں کا دل ٹوٹ گیا ہے اس کا کفارہ کون ادا کرے گا؟ ہمارا سماج جو شکست و ریخت کا شکار ہے اس کی ازسرِ نو تعمیر کون کرے گا؟ آج مزدور صرف آٹھ آنے کا کام کرکے دھوکے بازی سے ایک روپیہ کما لیتا ہے، چھوٹے چھوٹے ٹھیکیدار سپاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہزاروں روپے لوٹ رہے ہیں۔ چائے بگان کے محرر ہوائی اڈے میں مزدور بھجوا کر ہر دن پچاس ساٹھ روپے کما رہے ہیں، کیا ایسے لوگ آئندہ سدھر سکتے ہیں؟"

انوپما کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ جاتی۔

اس کے یہ خیالات دل ہی دل میں انوپما پسند نہیں کرتی۔ جب دنیا کے تمام لوگ ایک ہی رو میں بہے جا رہے ہیں تو سب غلط کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنے باپ کو دولت کماتے اس نے بچپن سے ہی دیکھا ہے۔ آج بھی ملٹری کے ٹھیکے کا کاروبار کرکے وہ کافی دولت کما رہے ہیں۔ اس لیے باکھر بھی اگر ٹھیکے کا کام کرتا تو وہ بھی عیش کرتی۔ اگر کروکشیتر میں بھگوان کے منہ سے گیتا نکل سکتی ہے تو پھر اس جوکیرٹی چائے بگان میں پھر سے کوئی ارجن نکل آئے۔ بھلا اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کبھی کبھی اس طرح بحث کرنے کی اس کی خواہش رہتی تھی پر باکھر کے سامنے یہ ساری باتیں کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ جب کہ اسے پتہ بھی تھا کہ یہ باتیں اسے پسند نہیں۔ پھر بھلا وہ ایسا کام کیوں کرے۔

پھر بھی باکھر دل ہی دل میں تسلیم کرتا کہ اس جنگ کی ضرورت ہے۔ صرف بے رحم اور جنگ پسندوں کے ہاتھوں میں اس دنیا کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اس سے امن و امان درہم برہم ہونے کے سوا اور کیا ہوگا۔ ہٹلر کو یورپ پر قبضہ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینے کا مطلب ہے تہذیب کو قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دینا۔ وطن سے نکالے گئے بے وطن یہودیوں پر من مانی کرنے کی اجازت دیدینے کا نام تہذیب نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف مشرق کی رہنمائی کرنے کے لیے جاپان

آگے آگیا ہے جو پورے ایشیا کے اتحاد کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ صرف غیر ملکی ہونے کے باعث کسی بے قصور انسان کو ننگا کر کے پیٹنا اگر تہذیب ہے تو پھر بربریت کسے کہا جائے گا۔ نئی زندگی حاصل کرنے کے باوجود بھی تو چین اب تک امن کے ذائقے سے آشنا نہیں ہو سکا ہے۔ چین بھلا آخر جاپان کو برداشت ہی کیوں کرے۔ طاقت کے نشے میں چور ہو کر نہایت دیدہ دیری سے جاپان نے نان کنگ کی راہ میں چین کی ماؤں کی بے حرمتی کی ہے۔ سنگینوں کی نوک سے معصوم بچوں کے جسموں کو چھید کر لطف حاصل کیا ہے۔

باکھر کا ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔

جنگ چاہیے۔ ان ظالموں کو بندوق کی سنگینوں کا مزا چکھانے کے لیے جنگ کی ضرورت ہے۔ کانٹے سے کانٹا نکالے بغیر چارہ ہی کیا ہے۔ لیکن شکستہ دل لے کر بھلا لوگ دنیا میں چین سے کیسے زندگی گذار سکیں گے۔ اس میں سے بھلا کون سی راہ درست ہے۔ اس کے ذہن کی کشمکش کا اظہار اس کے افعال سے بھی ہوا تھا۔

الوپما دیکھتی کہ وہ کافی کوشش کے بعد ہی ہنس پاتا ہے۔ شاکیہ دیکھیے! وہ گھر سے نکلتا ہی نہیں۔ ایک دن ڈیوڈ نے کہا ——

"باکھر، تمہیں کچھ ہو گیا ہے؟ آج کل تم کافی فکر مند رہا کرتے ہو؟"

وہ زبردستی کی ہنسی ہنس کر کہتا ——

"کچھ بھی تو نہیں ہوا ڈیوی۔ یوں ہی کبھی کبھی جی اچھا نہیں لگتا۔ بھلا یونہی کبھی کبھی تمہارا بھی جی اچاٹ نہیں ہو جاتا کیا"؟

یا کگی سے کچھ ہوا ہے"؟

"نہیں، نہیں، یہ سب کچھ بھی نہیں"۔ ڈیوڈ کو بے اختیار ہنسی آجاتی کگی، اس کا تعلق کتنا گہرا ہے۔ کگیؔ سے کتنی اپنائیت ہے۔ وہ خود کگی کی شخصیت کا ایک جزو بن گیا ہے یہ بات ڈیوڈ کو کیا معلوم؟

کھلے دل سے ہی ایک دن ڈیوڈ نے الوپما سے پوچھا ——

"کگیؔ بتا سکتی ہو کہ باکھر یوں دن بدن کیوں چپ ہوتا جا رہا ہے۔؟"

باکھر پاس ہی تھا۔ بول اٹھا ——

" او ڈیوی، تم بے کار ہی سر مغزی کر رہے ہو۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔
کل آؤ گے تو مجھے کافی خوش و خرم پاؤ گے۔" ڈیوی بولا ——

" ویسے تو کتنے ہی کل نکل گئے۔ اس وجہ سے میں ذرا فکر مند ہوں ——
کیوں ککّی؟" الو پما نے کہا ——

" اب میں تو انہیں کافی اچھا ہی دیکھ رہی ہوں۔ ہمیشہ معمول کے مطابق
کھاتے پیتے ہیں۔ اسکول جاتے ہیں۔ لوٹ آتے ہیں، تمہارے ساتھ جنگ
کے بارے میں اور امریکہ و بھارت کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے ہیں۔
مجھے تو ان میں کوئی بات خلافِ معمول محسوس نہیں ہوتی۔"

"۔۔۔ تم بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی ہو۔" ڈیوڈ بولا —— " اس
کا دل دن بدن کس طرح مرجھایا جا رہا ہے۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا ہے۔"

" اوہ! دل کی بات کہتے ہو"؟ ککّی بولی —— " اگر میرا خیال جاننا چاہتے ہو
تو بتا دیتی ہوں کہ کسی کا دل ٹٹولنے کی کوشش نہ کرنا ہی اچھا ہے۔ سمندر کو
نیلگوں سمندر کی شکل میں ہی دیکھنا اچھا ہے۔ اندر کی باتیں پتہ لگانے میں ساری
محنت ضایع جائے گی۔ یہاں تک کہ سمندر کی تھاہ مل جانے پر بھی دل کی تھاہ
نہیں مل سکتی۔" ککی کے چلے جانے پر ڈیوڈ نے کہا ——

" ککی ٹھیک ہی کہتی ہے باکھر۔" " شاید!"

کچھ لمحے خاموش رہ کر ڈیوڈ نے پوچھا —— " بھلا تم کیا سوچتے ہو؟"

" کیا تم ماہرِ نفسیات بن گئے ہو؟" —— باکھر نے ہنس کر کہا ——
" میں کیا سوچا کرتا ہوں؟ تم جو سوچتے ہو، میں بھی وہی سوچا کرتا ہوں۔ تم ایجا
کے بارے میں سوچتے ہو میں ککّی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ تم امریکہ کے
بارے میں سوچتے ہو، میں ہندوستان کے بارے میں۔ مورچہ پر جانا پڑیگا۔
تم اس سے ڈرتے ہوگے۔ اور میں، میں۔۔۔۔۔۔"

" اور تم اسکول جانے میں ذرا بھی نہیں ڈرتے" —— ڈیوڈ نے اپنی ہنسی
اس سے آہنگ کر دی —— " دیکھا نا، تمہارے اور میرے خیالات میں کہیں
پر اختلاف بھی ہے۔"

" ہاں! مان لو مجھے اپنے یہاں اپنی بیوی کے ساتھ سکون سے رہتے ہوئے

تم دیکھ رہے ہو لیکن تم اپنے ملک سے اتنی دور، ایما سے اتنی دور ہو، کتنے دنوں میں جنگ ختم ہوگی۔ کتنے دنوں بعد تم ایما کے پاس لوٹ سکو گے، پتہ نہیں۔ اور تمہارے متعلق کبھی کبھی یہی سب سوچتے ہوئے میں بہت اداس ہو جاتا ہوں۔ کتنے ڈیوڈ اپنی ایماؤں کے پاس لوٹ نہیں پائے ہوں گے۔ اس کا حساب بھلا کون رکھتا ہے؟"

باکھر کے چہرے کا کرب، ڈیوڈ ایک ٹک دیکھتا رہ گیا۔

لیکن باکھر کو ایک دن اس کے سوالوں کا جواب مل ہی گیا۔ اس دن شام کو جھٹپٹے کے وقت کسی نے مکان کے پورٹیکو میں آکر آواز دی ——

"کئی، او کئی!"

"کون؟" کہتا ہوا باکھر اٹھ کر باہر نکل آیا۔

اس نے بتی کی روشنی میں دیکھا، فوجی لباس میں ایک تندرست نوجوان! لبوں پر مسکراہٹ، ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس۔ اس نے پوچھا ——

"آپ باکھر شاکیہ ہیں نا؟ کئی ہے کیا، الوپما؟"

"جی ہے، آئیے۔" باکھر بولا۔

دونوں کے کرسیوں پر بیٹھتے ہی الوپما آگئی۔ نوجوان بول اٹھا ——

"ارے کئی! بھلا دیکھ تو تجھے ڈھونڈنے میں مجھے کس قدر پریشان ہونا پڑا ہے۔"

اچھی طرح اس کا جائزہ لے کر الوپما نے کچھ تامل کے ساتھ کہا ——

"کون، جیون دا، تم!"

"ہوں جیون دا، جیون دا ہی ہوں۔" جیون دادا نے کافی بے تکلفی سے کہا۔ "خیر پہچان تو پائی! اس اندھیرے میں کسی طرح تم لوگوں کا گھر میں نے ڈھونڈ ہی نکالا۔ اگر جرمنی میں ہوتا تو اتنی دیر میں گستاپو والے گولی مار چکے ہوتے۔"

باکھر چپ چاپ بیٹھا جیون دادا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انہیں وہ پہچانتا نہیں تھا۔ اس لیے الوپما اور ان کی بات چیت میں وہ حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی دشواری محسوس کرتے ہوئے الوپما نے تعارف کراتے ہوئے کہا ——

"او ، آپ نے جیون دادا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے نا ؟ یہ ہمارے تاؤ جی کے بڑے لڑکے کی اولادوں میں سب سے بڑے ہیں۔ گھر میں یہ کبھی رہتے ہی نہیں ہیں۔"

جیون دادا نے ہنس کر کہا ـــــ

"آپ کا جیٹھا سالا ہوں۔ نمسکار۔"

"نمسکار!" باکھر ہنسا۔ انوپما اندر چلی گئی۔

جیون دادا کے تئیں باکھر نے ایک انجانی کشش محسوس کی۔ ان کی صحت، بات چیت کا بے تکلفانہ انداز، کھلے دل کی ہنسی۔ غیر فطری اور غیر سماجی عادات و اطوار سے باکھر کے ذہن میں ایک ایسے خیال نے سر اٹھایا کہ جیون دادا کا جیون کچھ پُراسرار ہے۔ وہ اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ اپنے دل میں ایک عقیدت سی محسوس کر کے اس نے یہ منطق لگائی کہ اسے برا تو ہونا نہیں چاہیے۔ وہ برا ہو ہی نہیں سکتا۔

شاکیہ کے آنے پر ان سے بھی جیون دادا کا تعارف کرایا گیا۔ کچھ رسمی اور گھریلو باتیں پوچھنے کے بعد انھوں نے دریافت کیا ـــــ

"بیٹے، ابھی کر کیا رہے ہو تم ؟ کیا تعلیمی سلسلہ جاری ہے" ؟

جیون بولا ـــــ

"جی، میں پڑھتا نہیں۔ کاشی میں ایم۔ اے اور لا پڑھتا تھا۔ اب چھوڑ چھاڑ کر گھر ہی پر ہوں۔" پھر ذرا تامل کے بعد کہا ـــــ یہی سمجھ لیں کہ میں ابھی کچھ بھی کر نہیں رہا ہوں۔" انھوں نے جیسے سب کی نظریں موڑنے کی کوشش کی۔

باکھر کو لگا کہ آخری جملے میں کچھ اور بھی چھپا ہوا ہے۔ 'سمجھ لیں میں ابھی کچھ بھی کر نہیں رہا ہوں'۔ لیکن شاکیہ نے اس سے کوئی معنی نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ کھانے پینے کے بعد باکھر نے اس کے بارے میں چرچا کی تو اُسے اپنے بہت بڑے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

انوپما دادا کی خدمت گزاری میں لگ گئی تھی۔ بکس سے ایک دھوتی نکال کر کہا ـــــ

"بھیا کپڑے بدل لو۔ چائے بن چکی ہے۔ ہاتھ پیر دھو لو۔"

دھوتی ہاتھ میں لے کر جیون نے کہا ـــــ

"کمی! ڈبروگڑھ کی گاڑی سویرے کتنے بجے چھوٹتی ہے؟"

"ایک دم سویرے پانچ بج کر دس منٹ پر۔"

"تو پھر ان چند منٹوں کے لیے دھوتی کو گندا کرنا۔ ۔ ۔"

"باتوں کی پھلجڑیاں چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ بملا کے سامنے یہ سب کہہ سکو گے۔ اب آکر اپنے پیر دھو لو بس۔"

بملا نام کی لڑکی سے جیون دادا کی شادی کی بات چیت چلی تھی۔ باکھر اور جیون ہنس پڑے۔ جیون بولے ـــــ

"دھت، شریر کہیں کی۔ کیا پتا جی گھر میں نہیں ہیں؟"

باکھر بولا ـــــ "نہیں، کہیں باہر نکل گئے ہیں۔"

کھانا کھانے کے بعد جیون دادا کے لیے انوپما نے بستر لگا دیا۔ اس نے پوچھا ـــــ

"ایک اینڈی چادر رکھ دی ہے، کافی ہے نا بھیا؟ آج کل تو بہت زیادہ سردی بھی نہیں ہے۔"

"ہوگا، ہوگا رے!" جیون دادا نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ باکھر نے سگریٹ نکال کر ان کے سامنے کر دیا۔ انوپما بولی ـــــ

"بھیا کپڑے تمہارے سوٹ کیس کے اندر رکھے دے رہی ہوں۔ مسالے کا بٹہ ملا ہے نا؟ اور، آج کل تو شاید تم "تامول" بھی کھایا کرتے ہو نا؟"

اچانک جیسے کچھ سوچ کر جیون دادا نے کہا ـــــ

"سوٹ کیس کھول کر سارے روپے پیسے اپنے قبضے میں نہ کر لینا ری!"

جیون اور باکھر میں طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایک بار باکھر نے کہا:

"بردا، برا نہ مانیں تو آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اس وقت پتا جی سے بتایا تھا کہ میں ابھی کچھ بھی نہیں کر رہا ہوں۔ کیا اس کا کچھ اور مطلب ہے؟"

مسکرا کر جیون دادا نے کہا ـــــ

"آپ بہت حساس ہیں شاکیہ ۔ میری بات کے لہجے سے ہی آپ نے مجھے پکڑ لیا مگر آپ کے پتاجی محسوس نہ کر سکے ۔ ٹھیک ہی ہوا آپ سے میں کچھ بتاتا نہیں ۔ لیکن جو ہو ۔ آپ کسی کے پتی ہیں ۔ آج پہلی بار ملاقات ہونے پر بھی ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں ۔ میری اس بات کا ایک مطلب ہے"۔

باکھر منتظر رہا ۔ جیون دادا آہستہ آہستہ کہتے گئے :

"ملک کے سیاسی حالات تو آپ جانتے ہی ہیں شاکیہ، میرے اور آپ کے خیالات میں فرق ہو سکتا ہے لیکن یکسر اختلاف نہیں ہو سکتا ہے" جیون دادا کے چہرے پر اچانک ایک گمبھیرتا چھا گئی ——— "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب خاموش نہیں بیٹھا جا سکتا ۔ خاص کر گولی بارود کے اس زمانے میں ۔ کچھ لوگ گولی بارود کے ذریعے خفیہ طریقے پر حکومت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں ۔ دلّی کے شعبۂ نشر و اشاعت نے اس کا نام دے رکھا ہے 'سبو تاژ' یعنی انتشار اور توڑ پھوڑ کا کام ۔ میں بھی کہتا ہوں یہ کام تخریبی ہیں ۔ لیکن صرف اسے تخریب کہہ کر میں مطمئن نہیں ہو پاتا ۔ میرے خیال میں یہ تخریب تعمیرِ نو کے لیے ہے ۔ ایک بڑی چیز کو اگر برابر حصّے میں تقسیم کر کے کھانا ہو تو اسے توڑنا ہی پڑتا ہے ۔ میں نوجوان ہوں ۔ کہنا چاہیئے کہ پڑھائی لکھائی کی بھی تکمیل نہیں ہو سکی ۔ کم سے کم پیسے تو کما نہیں پایا ۔ ہم جیسے نوجوانوں کو کوئی دیکھنا نہیں چاہتا ۔ ہم جو بھی بات کہیں بے معنی ہے ۔ ہم جو بھی کام کریں لاحاصل ہیں ۔ ہم جو بھی جد و جہد کریں بے کار ہے ۔ اس لیے میں نے آپ کے پتاجی کے سامنے "کچھ نہیں کرتا" کہا تھا" سن کر باکھر متحیّر رہ گیا ۔

دنیا کی اکثریت کے خیالات کے برخلاف کچھ لوگ اندر ہی اندر خفیہ طور پر تخریبی کاموں میں لگے ہوئے ہیں ۔ یہ بات باکھر نے اڑتی پڑتی سنی تھی ۔ لیکن یہ بات کبھی اس کے تصور میں بھی نہیں آئی تھی کہ اس طرح کے ایک شخص کو وہ اپنے مہمان کی شکل میں دیکھ سکے گا ۔

جیون دادا کی طرف ایک ٹک وہ دیکھتا رہ گیا ۔

"شاکیہ برا نہ ماننا، میں اچھا مہمان نہیں ہوں ۔ پھر بھی آپ پکڑ نہ لیتے

تو میری زندگی کے اس پہلو کو یہاں کوئی بھی دیکھ نہ پاتا۔ بس ایک چیز تلاش کرنے کے لیے ڈھونڈتا آیا تھا۔ دو جاسوس گاڑی میں میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ گگی یہاں رہتی ہے، اچانک اس بات کا خیال آیا اور میں اتر پڑا۔ مجھے اندھیرے میں ہی یہاں سے نکل جانا پڑے گا۔"

باکھر نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بس جیون دادا کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

جیون دادا کہتے جا رہے تھے ـــــ

"یہ ہماری غلطی نہیں شاکیہ، موقع کا فائدہ اٹھانا ہی چاہیے۔ ہم نے پہلے جو کچھ سوچا تھا وہ اب ہو نہیں پائے گا۔ ہم اب دلی نہیں پہنچ سکتے۔ ہم میں کہیں خامی رہ گئی ہے۔ اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی۔ ہمارے پاس اب وقت نہیں رہا ہے۔ ہمیں اب زمین دوز ہو جانا پڑے گا؟ جرمنی کو خود سپردگی کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ جاپان کے دن بھی لد چکے ہیں۔ اس ہلچل میں ہمارے لیے سنہرا موقع تھا۔ وہ موقع ہم نے کھو دیا۔ مگر اس کے بعد بہت کام کرنے ہوں گے۔ لوگوں کے دل میں جو اتھل پتھل مچ گئی ہے اس کے نتیجے میں ہندوستان کو فائدہ ہوگا۔ دنیا میں جو انتشار کی آگ پھیل چکی ہے وہ جلدی سرد ہونے والی نہیں ہے۔ وہ بجھ جائے یہ ہم چاہتے بھی نہیں۔ خوابیدہ لوگ بیدار ہو جائیں گے تبھی تو وہ چوٹ کر سکیں گے۔ گاندھی جی ہمیں برا کہہ سکتے ہیں، اپنے ہی گھر میں لوگ ہمیں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں، پھر بھی ہم آزادی کے حصول میں مدد ہی پہنچا رہے ہیں۔ بے چین لوگوں کی یہ چوٹ ہی حقیقی جنگ ہوگی۔ اس جنگ کے بعد ہی سکون پیدا ہو سکتا ہے اس سے قبل نہیں۔"

جیون دادا کو سونے کے لیے کہہ کر باکھر بستر پر پڑ گیا۔ گگی پان لینے کے لیے آئی تو جیون نے کہا ـــــ

"گگی، مجھے پانچ بجے جانا ہی ہے، سمجھی! اگر ہو سکے تو مجھے جگا دینا نہیں تو بہت مشکل ہو جائے گی میرے لیے۔"

آدھی رات گزر چکی تھی۔ اس سیلانی آدمی کی بات سوچ کر باکھر کے منہ سے لمبی آہ نکل گئی۔ اس کے بہت اہم سوال کا جواب جیون دادا نے انجانے میں ہی دے دیا ہے۔ دنیا کی رفتار بدل چکی ہے۔ ٹوٹے دلوں کو

اب جوڑنے کی ضرورت نہیں۔ ان ٹوٹے ہوئے دلوں کی بے چینی سے ہی نئی دنیا کی تعمیر ہوگی۔ صرف امن کا پرچار کرنے پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ لوگوں کے بے عمل ہونے کے باوجود کانگریس کی تحریک بھی بے چینی اور انتشار کے درمیان ہی شروع ہوئی تھی۔ عوام کے دلوں کی بے چینی ہی دنیا کے رخ کو موڑ سکتی ہے اور اس کے بعد امن وسکون کا دور آسکتا ہے۔

باکھر کو اس کے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اس لیے وہ گہری نیند میں کھو گیا۔ صبح چار بجے نیند کھل جانے پر انوپما جاگ اٹھی۔ ہاتھ منہ دھوکر اس نے آگ جلائی۔ چائے کا پانی چڑھا کر وہ ناشتے کا انتظام کرنے لگی۔ تبھی باکھر بھی اٹھ گیا۔ دانت مانجھتے ہوئے اس نے پوچھا——

"کی! بروا کو جگا دوں کیا؟"

بستر پر سے ہی جیون نے آواز دی——

"کی! اٹھنے کا وقت ہوگیا کیا۔؟"

جیون دادا مچھر دانی اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ انوپما نے پاس آکر ان کا سر سہلاتے ہوئے کہا——

"چار بج رہا ہے بھیا! رات کو سو سکے تھے نا؟"

"ہاں، وہ بستر پر اٹھ بیٹھے۔ میں کافی دیر سے جاگ رہا ہوں۔ دوڑ دھوپ کرتے کرتے میں بالکل بوڑھوں جیسا ہو گیا ہوں۔ نیند بھی کم ہی آیا کرتی ہے۔"

نہ جانے کیا سوچ کر انوپما جیون دادا کی طرف کربناک نظروں سے دیکھتی رہی۔ باکھر نے آکر جیون دادا کی جانب ٹوتھ پاؤڈر کی ڈبیہ بڑھادی اور کہا——

"بروا، اُٹھ گئے؟ خیر دانت صاف کر لیجیے۔"

منہ ہاتھ دھوکر جیون دادا نے کپڑے پہن لیے۔ باکھر سوٹ کیس لے آیا۔ اسے کھول کر جیون دادا نے باکھر کے سامنے کر دیا۔ اس میں دو پستول تھے۔ وہ ایک ٹک دونوں کو دیکھتا رہ گیا۔ جیون دادا نے مسکرا کر سوٹ کیس بند کر دیا۔ پھر باکھر کی پیٹھ ٹھونک کر کہا——

"شاکیہ! دیکھ رہے ہونا ؟ میں خطرناک آدمی ہوں۔ اس کگی کا چہرہ دیکھ کر یہاں سے جانے کی خواہش نہ ہونے پر بھی میں بھاگ جانے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ اس میں آپ لوگوں کا ہی فائدہ ہے۔ آج رات کو بہت آرام سے سویا۔ بہت دنوں سے اتنی بے خبری کی نیند نہیں آئی تھی۔ شکریہ شاکیہ!"

تینوں نے چائے پی! باکھر نے ایک بار کگی کی جانب دیکھا۔ اسے جیون دادا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ اس نے شاکیہ کو جگا دیا۔ جیون دادا کو رخصت کرنے کے لیے دونوں اسٹیشن کی جانب چل دیے۔ بوڑھے شاکیہ دروازہ یوں ہی بھیڑ کر بستر پر پڑ گئے۔

تقریباً اندھیرے میں ہی آکر ریل اسٹیشن پر رکی۔ انوپما نے رندھے گلے سے کہا:

"بھیا خط دیتے رہنا۔ تم سے تو جلدی ملنا بھی مشکل ہے۔"

اپنا آنچل وہ آنکھوں تک لے گئی۔

اس کے جسم پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر جیون دادا نے کہا ـــــــ

"چھی، رو مت گگی۔ آ نہیں پاتا۔ اس کی وجہ سے کیا مجھے کم تکلیف ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے میں خط دوں گا۔ شاکیہ نمسکار، کگی کو میری باتیں بتائیں۔ چلوں کگی۔!" گاڑی چلی گئی۔

لوٹتے وقت باکھر نے انوپما کو جیون کے بارے میں ساری باتیں بتادیں۔ وہ حیرت زدہ چپ چاپ قدم بڑھاتی رہی۔ کچھ بھی نہیں بولی۔ اس کے دل میں یوں ہی ایک خوف کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ باکھر بولا ـــــــ

"بروا سے مجھے بھی ایک خبر مل گئی ہے کگی! تم جانتی ہو کہ جنگ کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن پریشان ہو گیا تھا۔

باکھر نے اپنے سب سے اہم سوال کا جواب بھی کگی کو بتا دیا۔

انوپما دوسری بار حیرت زدہ اس وقت ہوئی جب کہ سویرے تقریباً آٹھ بجے ایک پولیس کا اے۔ ایس۔ آئی، دو سپاہیوں اور خفیہ پولیس کے افسر کے ساتھ آپہنچے۔ حالاں کہ باکھر نے فرضی جواب دے دیے اس لیے انہیں مایوس ہو کر لوٹ جانا پڑا۔ جاتے جاتے خفیہ کے افسر نے کہا۔

" اف، اف، اس آدمی کو تلاش کرتا ہوا میں جورہاٹ سے یہاں آیا مگر وہ اچھا چھلاوہ نکلا۔ آپ کو بھی ویسے آدمی پر نظر رکھنی چاہیے شاکیہ۔

گرین نے کام چھوڑ کر ٹھیکیداری شروع کر دی ۔ باکھر کو معلوم تھا کہ پتا جی نے اُسے کافی رقم دی ہے ۔ گرین کا پارٹنر تھا بدرالدین ۔ اس کی دوکان اس کا بھائی چلا رہا تھا۔

گرین کی زندگی میں بھی تبدیلی آگئی تھی ۔ اس کے پاس آج کل کافی لوگوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ کوئی آتا کام ڈھونڈھنے اور کوئی تفریح کرنے ۔ اس کے جسم پر آج کل اپ ٹوڈیٹ قیمتی کپڑے ، ریشمی ملٹری سواک ، سوئیٹر اور منہ میں لگی اسٹائنک سگریٹ جنگِ عظیم کی وجہ سے انگریزی زبان کو بھی ہار ماننی پڑی ہے ۔ ساتویں جماعت تک پڑھے ہوئے گرین کے منہ سے انگریزی لاوے کی طرح پھوٹ نکلتی تھی ۔ قواعد اسکولی چیز ہے لیکن جنگِ عظیم کی تعلیم عملی زندگی کی ہے ۔ اسی وجہ سے گرین اور بدرالدین انگریزی یا آسامی کی کسی بھی قواعد کی خامی کی پرواہ نہیں کرتے تھے ۔

گرین کے جسم پر بھی گوشت چڑھ گیا تھا ۔ وہ آج کل کافی مشہور ہو گیا تھا ۔ بات چیت میں بھی گمبھیرتا آگئی تھی ۔ چال چلن میں بھی سنجیدگی آگئی تھی میز پر کاغذ پتروں کی ڈھیری اونچی ہوگئی تھی ۔ پہلے کی بیڑی کی جگہ وہ لکی اسٹائنک پیتا جو کبھی ہونٹوں میں سیدھی نہیں رہتی ۔

ایسے ٹھیکیدار جن کے نام بار ہا سنے تھے ۔ اور ایسے بھی جن کے نام پہلے کبھی نہیں سنے تھے ، سر شام باکھر کی پارٹیوں میں بیٹھے ماحول کو گرم کیے رہتے ۔ کبھی کبھی نرکانت بروا بھی آتے ۔ بدرالدین تو پارٹنر ہی ٹھہرا ۔ شاکیہ کا ایک ٹین کی چھت والا گھر جسے وہ لکڑی رکھنے کے کام میں لایا کرتے تھے ، کچھ دنوں سے بھیم کے ذریعے بانس کی ٹٹیوں سے گھیرا ڈلوا کر گرین نے اپنا دفتر بنا لیا تھا ۔ شاکیہ بہر حال معزز آدمی تھے ۔ ان کا اپنا ایک مقام تھا ۔ اس لیے اپنے مکان کو تجارتی کاموں کے لیے استعمال کرنے میں مشکلات درپیش ہو سکتی تھیں ۔ بھو کو دشواری ہو سکتی تھی ۔ کوئی آجائے تو اسے چائے بنانے میں ہی پریشانی ہو سکتی تھی ۔ اس لیے دفتر کا کمرہ اس نے الگ کر لیا ۔

بدر کہتا ــــ " یہ ٹھیک ہی ہے حاضر کا ؟ آفس باہر رہے تو ہم جب چاہیں بات چیت کر سکتے ہیں ۔ آخر بزنس کی بات ٹھہری نا ۔؟"

شاکیہ کہتے ——— "گرین، تو پھر ایک اور مکان ہی بنواتے دیتا ہوں۔
ایک ٹرک خرید لو۔ کرائے کے ٹرک سے اور کتنے دن کام چلاؤ گے۔؟"
انوپما کہتی ——— "تم سے تو آج کل بات کرنے میں بھی ڈر لگتا ہے۔ دن بہ دن
چہرہ جیسے بدلتا جا رہا ہے۔ دو چار دن نہ دیکھیں تو شاید پہچان بھی مشکل ہو جائے گی۔"
باکھر کہتا ——— "جیتے رہو میرے نوجوان۔"
بھیم کہتا ——— "فل بابو، تو آج کل انہیں 'فل بابو' کہنے دینا ہی نہیں
چاہتے۔ کہتے ہیں کہ آج کل وہ 'فل بابو' کا کام نہیں کرتے۔ آج کل ٹھیکیدار"...
گوری تصحیح کرتی: "ٹھیکیدار نہیں، کنٹراکٹر۔"
دیکھتے دیکھتے گرین کا لاابالی پن ایک دم ختم ہو گیا۔ پہلے وہ باکھر، انوپما،
بھیم، گوری سب کے ساتھ گپیں لڑاتا تھا۔ شاکیہ کے اس سونے مکان میں
عورت کی شکل میں پہلی بار گوری ہی آئی تھی۔ اسی وجہ سے شاکیہ، باکھر اور
گرین تینوں اس سے ہر بات میں ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ انوپما کے آنے
پر اس کا سلسلہ خود بخود کم ہو گیا۔ باکھر اور شاکیہ اس سے الگ ہو گئے۔
عمر کے تقاضے کے تحت ختم ہوتی امنگوں اور کچھ سماجی حجاب کی وجہ
سے شاکیہ خاموش رہنے لگے تھے۔ خاص کر بہو کے تئیں بزرگانہ شفقت
برتنے میں وہ پگھل سے جاتے تھے۔ من پسند ہم سفر پا کر باکھر کے لیے اب
علیحدہ سے کسی طرح کی گپ بازی یا تفریح کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی
انوپما نے جسمانی اور ذہنی دونوں ہی پہلوؤں سے گھیر کر اسے مصروف کر رکھا تھا
پر گرین تو گرین ہی رہا۔ کڑی محنت کرنے، دھوپ اور بارش کی
سختیاں برداشت کرنے کے بعد جسم میں زندگی کی رمق باقی رکھنے کے لیے
اسے صنفِ مخالف کے لمس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اسی لیے دوسروں
کی طرح وہ بھی گوری کو اپنے ذہن سے جھٹک نہیں سکا۔ اس کے ذہن سے گوری
کے الگ ہٹ جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ محنت کرنے والے لوگوں کو
کئی جانب سے عورت کی ضرورت رہتی ہی ہے۔
"فل بابو" گرین جس وقت فیلڈ میں کام کرتا تھا تو گوری اس سے
کبھی کبھی پوچھا کرتی تھی ——— "تمہیں فیلڈ میں کام کرنے کے لیے کافی روپے

ملتے ہیں نا ؟ کتنے ملتے ہیں بھلا ؟"

"کافی ملتے ہیں، کافی! کیا تو چلے گی ؟ کل گھر میں تجھے آخر کتنا ملتا ہے ری؟ چھ آنے ؟ اس پر بھی دن بھر چلنی بنگلے میں گھس کر دھول کے بیچ چائے کی پتیاں چننے کا کام ؟ دھت، فیلڈ میں کام کرنے پر کافی روپے ملیں گے۔ ہر روز تین روپے، پانچ روپے۔"

گوری سوچا کرتی، کافی روپے ہیں۔ مگر وہ جواب دیتی ——

"نہیں چاہئیں ہمیں روپے۔ چھ آنے سے ہی کام چل جاتا ہے۔ کیا ہوگا روپے سے ؟ یوں ہی کافی ہیں۔"

"اونہہ، کیا چل جاتا ہے ری ؟ سات یا آٹھ روپے میں کھانے کو ہی کیا ملتا ہے گوری! چاول خریدنے میں ہی نکل جاتے ہیں آدھے پیسے۔ دال، نمک وغیرہ سامان تو ہے ہی۔ ایک مرغی خریدی کہ بس پیسے ختم۔" پھر گرین اسے پھسلانا شروع کرتا —— "فل میں کام کرنے پر اس کے روپیوں سے اچھی چیزیں خرید پائے گی —— ریشمی رومال، خوشبودار تیل، صابن، لال نیلی ساڑی، بلاؤز، پاؤڈر —— جوان چھوکری کو یہ سب چاہیے ہی۔"

دل ہی دل میں اچھا لگنے پر بھی گوری وہاں سے ہٹ جاتی۔

اسی طرح کے چھوٹے موٹے ہنسی مذاق ان لوگوں میں چلتے رہتے۔ لیکن گرین میں اب تبدیلی آگئی تھی۔ وہ فل بابو سے اب کنٹراکٹر بنا ہے۔ معمولی محرر سے مشہور ٹھیکیدار۔ آج کل وہ گوری کے ساتھ نہ تو پہلے کی طرح کھل کر ہنسی مذاق کرتا تھا اور نہ ہی سطحی من بہلاؤ کی باتیں۔ جس تس کے سامنے وہ گوری کو پکارتا بھی نہیں تھا اور تو اور غیر ضروری باتیں بھی نہیں کرتا تھا۔ جنگِ عظیم کے ٹھیکیدار کی قیمت بھی تو کافی ہوتی ہے۔

پھر بھی گوری گرین سے دور نہیں جا سکی بلکہ پوشیدگی کے غلاف میں تو اسکی حالت اور بھی معمّہ بن گئی۔ آنکھ مچولی کھیلتے وقت چھپے ہوئے کو ڈھونڈنا ہی اچھا لگتا ہے۔ کھلے میں رہنے والا اتنا مشوک نہیں بنتا۔ راز کے پیچھے آدمی باؤلا سا گھوما کرتا ہے۔ پہلے کی گوری محض مذاق کا موضوع تھی۔ دو ایک بار منہ سے من بہلاؤ کر کے تھوڑی دیر کے لیے یاد رہتی مگر پردے کے اندر جانے پر گوری کا تصوّر جیسے گرین کی زندگی کا لازمی جزو بن گیا۔

اس وجہ سے گرین کبھی کبھی کہا کرتا ــــــ

"گوری، تو چل، فل میں کام کرنا ۔ تو، تو سنتی ہی نہیں ۔ تیری جیسی چھوکریاں تو کافی روپے کما رہی ہیں آج کل ۔ نادان تو ہی ایک دم بھولی بنی ہوئی ہے ۔ چل میں تیرے لیے کام کا انتظام کردوں گا۔"

کبھی کبھی گرین گوری کو مارواڑی کی دوکان سے کچھ لانے کے لیے بھیجتا ۔ کچھ پیسے بچ جانے پر وہ گوری سے کہتا ــــــ

"لے ری، یہ تیرا رہا ۔"

گرین اور گوری کو تنہائی میں باتیں کرتے اچانک انوپما نے ایک دو بار دیکھ لیا تھا ۔ دونوں دفعہ ہی وہ دونوں پکڑے لیے گئے ۔ ملزم کی طرح فوراً وہاں سے ہٹ گئے تھے ۔ دونوں دن تو وہ باکھر سے بتا نہیں سکی تھی ۔ باکھر نے گرین سے بات چیت کافی حد تک کم کر دی تھی ۔ گوری سے بھی وہ اس کے متعلق بات نہیں کر سکتی تھی ۔

ایک دن رات کو سوتے وقت باکھر کو صاف سنائی پڑا کہ گھر کے اندر بھیم اور گوری جھگڑ رہے ہیں ۔ بحث کے بعد بھیم غضبناک ہو کر گرجنے لگا اور گوری نے رونا شروع کر دیا ۔ انوپما بستر پر لیٹی تھی لیکن سوئی نہ تھی ۔ اس نے باکھر کی طرف دیکھا، باکھر نے بھی اس کی طرف دیکھا ۔ تقریباً بات دونوں کی سمجھ میں آ گئی تھی مگر کھل کر کچھ کہنے کے لیے انہیں مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے ۔ شاکیہ بھی سوئے نہ تھے ۔ دروازہ کھول کر وہ باہر آئے اور زور زور سے دو بار کھنکھارنے کے بعد دروازہ بند کر کے سو گئے ۔ بھیم اور گوری دھیرے دھیرے چپ ہو گئے ۔

ایک دن بھیم نے باکھر سے تنہائی میں کہا ــــــ

"باکھر بھیّا، یہ سب اچھی بات نہیں ہے ۔ تم کچھ کرو ورنہ میں کسی روز کچھ کر ڈالوں گا ۔ تب برا ہوگا ۔ آخر آدمی کی کچھ عزت تو ہے نا؟"

باکھر سوچ میں پڑ گیا ۔ تب شاکیہ بھی گرین کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے ۔

ایک دن آدھی رات کو نیند ٹوٹ جانے کی وجہ سے باکھر باہر نکل آیا تھا ۔

وہ برآمدے کی بتی جلاتے ہی دنگ رہ گیا۔ گرین کے کنٹراکٹری دفتر سے دوڑ کر گوری نکل گئی۔ ننگی چھاتی پر جلد بازی میں ساڑی کا پلو ڈالنے کی اس نے ناکام کوشش کی۔ وہاں سے آہستگی سے جاتے ہوئے گرین کو باکھرنے پیچھے سے پکارا ـــــــ "گرین!"

"ـــــــ تم ابھی ابھی مجھ سے پورٹیکو میں ملو" ـــــــ باکھر بولا۔

گرین چلا گیا۔ باکھر اندر آیا۔ بے چارا ٹھکرایا ہوا شوہر پیچ و تاب کھا کر کافی دیر تک نیند سے نبرد آزما رہ کر سو گیا تھا۔ اسے علم نہ تھا کہ اس کی بدکردار بیوی لالچ کے سمندر میں بہہ کر بہت دور جا چکی ہے۔

باکھر پورٹیکو کی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر کی طرف سے آکر گرین وہاں پہلے سے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اندھیرے میں سگریٹ پی رہا تھا۔ کچھ بھیانک سی بات ہونے والی ہے اس کا شبہہ اسے تھا۔ لیکن چپ چاپ سگریٹ پھونک کر خوف کو کچھ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بتی جلائے بغیر ہی باکھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

تقریباً پانچ منٹ سناٹے میں ہی گزر گئے۔ باکھر سوچ رہا تھا کہ کسی طرح سے جواب دے کر جلد از جلد وہاں سے چلا جائے اور جا کر ڈنڈما میں کہیں رہے۔

بالآخر باکھر نے کہا ـــــــ

"گرین، تم نے بڑا برا کام کیا ہے۔"

گرین نے انکار نہیں کیا۔ کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔

کچھ دیر رک کر باکھر بولا ـــــــ

"میرا پورا گھر تم دونوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ تم سے ایسی حرکت کی امید نہ تھی۔ کم سے کم تم جب یہاں پہلے پہل آئے تھے اس وقت کی بات تمہیں یاد رکھنی چاہیے تھی۔ تمہیں نصیحت کرنے کے لیے میں نے نہیں بلایا۔ اس سے کام ہونے والا نہیں ہے، یہ بھی مجھے علم ہے۔ تم کل یا پرسوں تک یہاں سے چلے جانا۔ پتاجی کو یہ بات معلوم ہے یا نہیں مجھے پتہ نہیں۔ ان سے کہنے کی ضرورت بھی میں نہیں سمجھتا۔ تم ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ۔"

گرین نے کچھ نہیں کہا۔ باکھر نے خشک لہجے میں پکارا ـــــ "گرین!"
"ہوں!" گرین نے جواب دیا۔ اس سے اُس کی مرضی کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ باکھر نے اسی لہجے میں کہا ـــــ "اب چلے جاؤ۔"
گرین سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔ کچھ لمحے وہیں بیٹھے رہ کر باکھر نے غصّہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ وہ اٹھ کر اندر چلا ہی تھا کہ کسی سے ٹکرا گیا۔ اندھیرا ہونے پر بھی اس نے اندازے سے پکارا "کُکی!"
انوپما نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "آیئے اب سو رہیے۔" وہ باہر آکر دروازے کے اس پار سے اس معمولی واقعے کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ اس شبہہ سے وہ اس کے قریب رکی ہوئی تھی۔ اُس نے اُس کے جسم کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "چلو!"
گرین گاؤں کا لڑکا تھا۔ دل میں پاکیزہ جذبات اور روایات کا احترام اس معاشرے کی خصوصیات تھیں۔ بچپن سے ہی سماج اور بزرگوں سے دینی تعلیم اُسے ملتی رہی تھی اس لیے باہر جانے سے وہ ہمیشہ ڈرتا تھا اور جاتا بھی نہیں تھا۔ شادی کے مقدس رشتے میں بندھنے کے علاوہ نفسانی خواہشات کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ خوش اخلاق اور اچھے کردار والا یہ محنت کش نوجوان گرین سماج میں کتنا ہر دل عزیز تھا۔ لیکن دکھاوے اور چھل کپٹ کی اس دنیا میں آجانے کے بعد نیز جنگِ عظیم کی ہوا لگ جانے کے باعث وہ ساری قدروں سے بے بہرہ ہوگیا۔ اس کی اخلاقی قدروں کی موت ہوگئی۔ کسان کے بیٹے گرین کی کوکھ سے ایک نیا گرین پیدا ہوا تھا۔ کنڈ اکٹر گرین نئے دور کا ـــ جنگی سپاہیوں کے مظالم کی خبریں اخبار میں نہ آنے کے باوجود بھی لوگوں کی زبان پر چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی گھناؤنی زندگی کے نزدیک آکر ایک دن گرین اپنے آپ کو کھو بیٹھا۔ اس کی زندگی میں غیر محسوس طور پر ایک تبدیلی آتی گئی۔ وہ زلیست کے نئے ذائقوں سے آشنا ہوا اور اس کے خرچ میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ صحت بنانے کے بہانے ایسی چیزوں کا بھی استعمال کرنے لگا جن کے نام پہلے کبھی سنے بھی نہیں۔ تن ڈھکنے کے نام پر دکھاوے کی خواہش ہوئی۔ اندر اور باہر کو ڈھیلا کردینے والی جنس مخالف کی کمی شدت سے کھٹکنے لگی۔
تیسرے دن گرین چلا گیا۔ ڈمڈما کے کلیا پانی محلے کی جانب اسے ایک مکان مل گیا۔ جانے وقت باکھر یا شاکیہ کسی سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ انوپما کے ہاتھ میں ایک لفافہ دے کر کہا ـــــ

"بھابی، پھوپھا جی کو یہ دے دینا۔ ایک ہزار روپے ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ اگر ہو سکا تو کل ایک بار آجاؤں گا۔"

حالاں کہ وہ نہیں آیا۔

اس کے بعد ایک دن بھیم سے جھگڑ کر گوری بھی لائن میں چلی گئی۔ زن و شوہر میں ایک بار جو غلط فہمی پیدا ہوئی وہ پھر کبھی ختم نہیں ہوئی۔ جس بات سے جھگڑے کی شروعات ہوئی وہ ختم ہونے کے لائق تھی بھی نہیں۔ گرین کے چلے جانے کے بعد بھی ان کے درمیان تنازعہ چلتا رہا۔ آخر میں ایک دن شام کو جھگڑا کر کے گوری لائن کی طرف چل پڑی۔

دوسرے دن بگل آکر بھیم کو بھی لائن میں لے گیا مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ بھیم نے خود بھی سمجھا بجھا کر دیکھا لیکن گوری کو لوٹایا نہیں جا سکا۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ اب شوہر کے ساتھ نہیں رہے گی۔

بھیم لوٹ آیا۔ اس نے اپنے کپڑوں کو جھاڑ کر کہا ـــــ

"جا کلپھنی تو نہیں رہے گی تو کیا میں اکیلا نہیں رہ سکتا؟ مر، جا کر کہاں مرتی ہے۔ میرا کیا ہے؟"

وہ اس طرح سے کپڑے جھاڑ رہا تھا جیسے جسم پر لگی ہوئی گوری کی گندگی بھی جھاڑ کر پھینک دینا چاہتا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ عورت کے کردار اور مرد کی قسمت کی بات تو آدمی کیا فرشتے بھی نہیں جان سکتے۔ بالکھر حیرت زدہ تھا کہ آخر گوری نے ایسا کیوں کیا؟ آخر کیا نہیں تھا اس کا؟ کیا وہ بھیم کے پیار میں باؤلی نہیں ہوا ٹھی تھی؟ کہاں گیا اس کا وہ پیار؟ وہ تو پیار ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ لالچ تھا، گوشت کا لالچ، نہ پا سکنے والے کو پانے کا لالچ اور اس کی خواہش۔

شاید لالچ ہی تھا۔ لالچ میں اندھی ہو کر ہی ایک دن اس نے خود کو بھیم کے سپرد کر دیا تھا۔ شاید ایک دن خود کو بھیم میں ضم کر دیتی۔ لیکن کبھی کبھی انسان تبدیلی کی خواہش میں پڑ کر گزشتہ ساری باتیں فراموش کر دیتا ہے ـــــ نئے افق کی تلاش کرتا ہے اور پھر بہک جاتا ہے۔ بھیم کے مقابلے میں گرین زیادہ کشش رکھتا ہے۔ گرین کی دولت، عزت، صحت، جوانی، لباس سب

کچھ اس سے برتر ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لالچ ہو کیوں کہ اس میں کشش زیادہ ہے ۔ لالچ کے ہاتھوں شکست اٹھانے میں جو لطف ہے اس کی رو میں بہنے کے بعد زندگی کے آدرشوں ، اصولوں اور اخلاقیات کی بات یاد نہیں رہتی یا پھر انہیں یاد رکھنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی ۔

ایک دن گری رینو کے ساتھ باہر آئی ۔ اس نے انوپما سے شکایت کی۔
"آپ بڑی وہ ہیں ۔ لگ بھگ ایک ماہ سے ہمارے یہاں نہیں آئیں ۔ ہمارے نئے مکان کا افتتاح ہوتے بھی ایک ہفتہ ہو گیا ۔ بھول کر بھی آپ نے نہیں سوچا کہ چل کر دیکھ آئیں "۔
انوپما نے ہنس کر بات کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ۔ گری کے یہاں سے مکان کے افتتاح کا دعوت نامہ ضرور آیا تھا لیکن وہ جا نہیں سکی تھی ۔ اس نے کہا ——
" مت پوچھو ، گری فرصت ہی نہیں ملتی ۔ کسی روز چلوں گی "۔
مگر گری آج ٹھان کر آئی تھی ۔ کہا —— "کسی دن نہیں ، آج ہی چلنا ہوگا "۔
آخر اسے ڈھڑما جانا پڑا ۔
دو منزلہ مکان کے وسیع ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی گری نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر صوفے پر بیٹھا دیا ۔ پھر کہا ——
"آپ یہیں بیٹھی رہیے ، اٹھنے کی کوشش بالکل نہ کیجیے ۔ رینو تو یہیں رہ ، میں ابھی ابھی آ رہی ہوں "۔
وہ اندر چلی گئی ۔ جانے سے قبل وہ انوپما کو دکھانا چاہتی تھی کہ اس فوٹو کی طرف دیکھو جسے باکھرے نے دیکھا تھا ۔ پھر دروازے کے قریب کا ایک ڈرا اور یوں ہی کھول کر باہر نکل گئی ۔
نئے مکان میں انوپما کو سچ مچ سب کچھ نیا نیا سا لگا ۔ صوفہ سیٹ نیا تھا ۔ چارج شیشم کی ایک پرانی تصویر کے پاس گاندھی جی کی ایک بڑی تصویر ٹنگی ہوئی تھی ۔ آرگن ایک کونے میں رکھا ۔ دوسری طرف ایک ناگا مالا

اور کھاسیہ تیر کمان جیسے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے ہوں ــــــ

چند لمحوں بعد رینو بھی وہاں سے نکل گئی۔

گری نے جس نوجوان کی جانب اشارہ کیا تھا اسے ایک نظر دیکھ کر انوپما ڈراویر کے پاس آئی۔ کھلے ڈراویر میں سیدھے رُخ سے پڑا ایک فوٹو اور بھی تھا۔ ملٹری پوشاک میں ملبوس ایک نوجوان کا۔ انوپما سمجھ گئی، یہ بھی وہی پہلے والے نوجوان کا ہے۔ ڈراویر کو کھلا ہی چھوڑ کر وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

گری ماں کے ساتھ آئی۔ وہ کہتی آرہی تھی، ماں، بھلا دیکھو نا، یہاں آنے کے لیے میں بھابی سے درخواست کرتے کرتے پریشان ہوگئی۔ آج انہیں کسی طرح گھیر گھار کر لائی ہوں۔

ماں نے کہا ــــــ "ہٹ ری یوں بکواس نہ کیا کر۔"

انوپما بولی ــــــ "بھلا اس کی باتیں تو سنیئے۔ کہتی ہے بیس مہینے بھر نہیں آئی اس لیے چلنا ہی ہے۔"

"نہیں تو پھر کیا"؟

انوپما نے دیکھا کہ گری کپڑے بدل کر آئی ہے۔ بال کھلے اور منتشر۔ پاؤڈر لگا چہرہ پانی سے دھلا ہوا، ننگے پیر۔ اس کے پورے جسم میں نہ جانے کون سی مستی بھری ہوئی تھی۔ وہ مستی کپڑوں کی نہیں، شان و شوکت کی نہیں بلکہ مستی جیسے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کے اثر سے جیسے اس میں آندھی جیسی قوت آگئی ہو۔ وہ فوراً ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔

ماں انوپما کو اپنے پاس بٹھا کر طرح طرح کی باتیں کرنے لگیں۔ ان کی دنیا محدود تھی اس لیے بات چیت بھی سبزی ترکاری، چاول، دھوپ، بارش وغیرہ تک محدود رہی۔ حالانکہ وہ اس محدود دنیا سے غیر مطمئن نہیں تھی۔ دو لڑکیوں کو زمانے کے مطابق کھلا، پہنا لے تو اسے اور کیا چاہیے۔ جاپان اور جرمنی کے خلاف اسے کوئی نفرت نہیں تھی۔ چوکیرٹی کے مشہور کنٹراکٹر تر کانت بر داسے بھی اس کا تعارف نہیں۔ اس وجہ سے سلیقے سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں نرم و گداز صوفے پر بیٹھے ہونے کے باوجود اس نے پکارا زینو تا مول کا بٹہ لے آ۔

رینو بٹھ دے گئی - اسے سامنے رکھ کر وہ تامول (کچی سپاری) کاٹنے لگیں۔
کچھ دور پر ٹنگے تیر کمان جیسے ہنسنے لگے - ناگا بھابے کی زبان سے پانی نکلنے لگا۔
اس کے دانت اور ہونٹوں کو دیکھ کر انوپما سمجھ گئی کہ وہ تامول کی بہت
دلدادہ ہے۔ اس نے کہا ـــــ

"مکان کو اس طرح نئی نئی چیزوں سے سجا رکھا ہے مجھے پتہ ہی نہ تھا۔"

ماں بولی ـــــ

"اور نہ کہو، اس گری کی وجہ سے تو مصیبت ہے - کہاں ڈبرو گڑھ میں اس
رائے صاحب کے یہاں دیکھ آئی، کلکتے سے لایا ہوا ایک صوفہ سیٹ - آکر پتا جی
سے کہنے لگی کہ ہمیں بھی لانا چاہیے - باگھ جان کے صاحب کے یہاں سے لایا ہوا
پرانا سیٹ بیچ ڈالا - یہ سب حال ہی میں لے آئی ہے - مہینے بھر سے تو یہی سب
کر رہی ہے۔" انوپما نے دھیرے سے کہا ـــــ

"ٹھیک ہی ہے۔"

"اس کی شادی جلد کر دینے کے بارے میں سوچ رہی تھی - تیز پور میں ایک
لڑکا ہے، گھر بار بھی اچھا ہے - اس بار جورہاٹ جاتے وقت اس سے ملے بھی تھے۔
اس کے پتا بھی ایک بار ہو آئے ہیں۔"

"کیا سچ"؟ انوپما نے جسم کو جنبش دی ـــــ "لڑکا ایم - اے - میں پڑھ رہا
تھا لیکن جنگ کے زمانے میں پڑھنا لکھنا چھوڑ کر ملٹری میں چلا گیا - ابھی گھر پر نہیں
رہتا - اس دن سنا کراچی سے یا کہاں سے خط آیا ہے۔"

انوپما نوجوان کی تصویر کی جانب دیکھ رہی تھی - پوچھے یا نہ پوچھے اس ڈھنگ
سے کہا ـــــ

"یہ کون ہیں؟ یعنی کہاں کے ہیں"؟

"یہی وہ لڑکا ہے - جینت نام ہے۔" اس نے ایک بڑا تامول منہ میں ڈال
لیا اور انوپما کی جانب بھی بڑھاتے ہوئے کہا۔ "گری پھر سے میٹرک کا امتحان
دے رہی ہے نا - پتا جی نے بھی کہا ہے کہ میٹرک پاس کرے اس کے بعد شادی
کا انتظام ہو جائے گا مگر میٹرک کا امتحان تو بس ہوا ہی سمجھو - پڑھنے لکھنے میں
دل لگے تب نا؟ صرف گانے بجانے سے کیا پڑھائی ہو سکتی ہے، مہینے میں چار
پانچ بار ڈبرو گڑھ تنی چکیا کا چکر لگنا تو ضروری ہی ہے۔"

سامنے کا ایک کمرہ گری نے مہمانوں کو چائے ناشتہ کروانے کے لیے آراستہ کر رکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بینگنی رنگ کی کرسیاں میز پوش سے ڈھکی ہوئی، ان پر گری کے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بیل بوٹے! انہیں دروازے تک چھوڑ کر ماں چلی گئیں۔ انوپما، گری اور رینو کھانے بیٹھیں۔ باورچی نے کھانا لگایا۔ چینی کے بیل بوٹے دار برتن میں پہلے خالص گھی میں تلی ہوئی پوریاں ایسی کہ ہاتھ سے چھوتے ہی بکھر جائیں منہ میں ڈالتے ہی پگھل جائیں۔ شیشے کے گلاسوں میں برف ڈال کر ٹھنڈا کیا ہوا صاف پانی۔ اس کے بعد آیا آملیٹ اور آلو کے چپس۔ کانٹے، چمچے اور چھری سے کھانا تھا۔ انوپما کو تامل ہو رہا تھا لیکن اس کی مشکل رینو نے آسان کر دی۔ انوپما کو بہت شرمندگی ہوئی۔ اس کے بعد چائے آئی۔ انوپما نے کہا ——

"گری، اتنا سارا کھانہ کھانا کیا پیٹ پر ظلم نہیں ہے"؟

گری بولی ——

'ہونے دیجیے ظلم۔ آج آپ پر ظلم کرنے کے لیے ہی تو ساتھ لائی ہوں'۔

اس کے بعد گری جدید طرز سے سجائے گئے کمروں کو ایک ایک کر کے دکھاتی گئی۔ یہاں تک کہ باورچی خانہ بھی۔ سبھی کمروں میں شطرنجی بچھی ہوئی تھی مگر ڈرائنگ روم کی شطرنجی سب سے نفیس تھی۔ بروا کے کمرے میں مہارانی ایلزبیتھ کی تصویر داخل ہوتے ہی نظر آتی تھی۔ کل لائی ہوئی مائیکے کی تصویر اب تک ٹانگی ہی نہیں گئی تھی۔ کستوربا کی تصویر بھی میز پر پڑی ہوئی تھی۔ آویزاں کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ لکشمی کی تصویر تو انوپما کو کہیں نظر ہی نہیں آئی۔ اس نے سوچا تو پھر دیوی نے اتنی ساری دولت نرکانت بروا کو کیوں دی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بروا تو دیوی کی پوجا ہی نہیں کرتا۔ دیوی کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے

مکان دیکھنے کے بعد ڈرائنگ روم میں گری اور رینو کے رقص کا دور چلا۔ دفتر کے کمرے میں نرکانت بروا ٹھیکے داروں سے چیخ چیخ کر بحث کر رہے تھے۔ موضوع تھا —— جرمنی نے بھلے ہی ہتھیار ڈال دیے ہوں لیکن جاپان کو جلد ہرانا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ جاپانیوں نے مغربی اسپرٹ کو بھی اپنا لیا ہے۔ اسی وجہ سے جاپان مغربی ممالک کے برابر ہی طاقتور ہے۔

انوپما گھر واپس آئی تو کانٹے چمچے کا سبق سیکھنے کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ رینو اس طرح سے اس کی توہین کرے، یہ بات وہ کسی بھی طرح برداشت نہیں کر سکی۔ شرم و ندامت کے ساتھ ساتھ اسے اپنے دل میں ایک کرب کا سا احساس ہوا۔ گری کا نیا مکان، قیمتی اسباب، ناشتے کا اہتمام، ڈرائنگ روم کے رقص اور گیت وغیرہ وغیرہ اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ باکھر کے میزپوش کے پھول بوٹے بھدے ہیں۔ دروازے کا پردہ گندہ ہو گیا ہے۔

رات کو باکھر سے اس نے دن بھر کے تجربات بیان کیے تو باکھر نے محسوس کیا کہ اس کے سانس کی رفتار قدرتی طور پر تیز ہو گئی۔ اس نے کہا——

"اصل میں بات کیا ہے، سمجھتی ہو گی؟ نرکانت بردا جو کاغذ کے بنڈل کما رہا ہے اگر انہیں اس طرح خرچ نہ کرے تو دیمک چاٹ جائے گی۔ گری موسم کے پھل کا استعمال موسم میں کر کے ٹھیک ہی کر رہی ہے۔"

انوپما کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ وہ کالج میں پڑھی لکھی تھی۔ آراستہ و پیراستہ مکان میں رہنے کی خواہش اس نے اپنے دل میں پال رکھی تھی۔ ڈرامے میں ہی جا کر اس نے یہ خواہش جگا لی ہو، ایسی بات نہیں تھی۔ مگر باکھر کی بس "سب کچھ صرف موہ اور مایا ہے" والی بات اسے پسند نہ آئی۔

آخر کیوں؟ دنیا کی مٹی سے نمودار ہونے والی ان نعمتوں سے وہ کیوں محروم رہے؟ گری کے بیل بوٹوں کے مقابلے میں باکھر کی میز کے بیل بوٹے کمتر کیوں ہوں؟ پردے کیوں گندے ہوں؟ مگر وہ، باکھر کو بخوبی جانتی

تھی کہ وہ جنگ کے ٹھیکے کا کام نہیں کرتا، روپے نہیں لوٹتا۔ میز پوش کے گل بوٹے دل کش ہیں یا نہیں اسے اس کا علم نہیں ۔ موہ میں نہ پڑ کر خوشی کے ساتھ زندہ رہنا ہی باکھر کی زندگی کا اصول ہے ۔ اسے کچھ دکھ سا ہوا ۔ اس نے باکھر کی طرف دیکھا. وہ سکون سے سو رہا تھا. صحت مند چہرے پر سکون کا احساس ۔ گہری نیند میں سوئے ہوئے اس شخص کے سینے کا زیر و بم انوپما نے محسوس کیا ۔ اس کے دل میں ساری دنیا کا درد شامل ہے ۔ اسے اپنی فکر نہیں ، لیکن کسی کے لیے اس کا دل محبت کے جذبات سے لبریز ہے ۔ اس کے پاس کسی کو ادھار دینے کے لیے دولت بھلے ہی نہیں لیکن لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے محبت بھرا دل ہے ۔

اس کے ہونٹ کانپ اٹھے ۔ اس نے محسوس کیا کہ باکھر کے تئیں دل میں کسی طرح کا برا خیال بہت بڑا گناہ ہے ۔ دل ہی دل میں 'میرے دیوتا' کہتی ہوئی باکھر کے سینے سے لگ گئی ۔ دنیا کی فکر سے آزاد ہو جانے کی کوشش کی ۔ اس نے گری رینو کو بھی بھول جانے کی کوشش کی ۔ وہ باکھر سے الگ ہو کر رہ نہیں سکتی ۔

سویرے اٹھ کر انوپما نے پردہ کھول کر دھونے کے لیے باہر ڈال دیا ۔ میز پوش ہٹا کر الگنی پر ٹانگ دیا اور ادھورے میز پوش کو دوسرے دن پورا کرنے کے لیے سوئی اور سوت تیار رکھ دیا ۔ باہر کی بیٹھنے والی بنچ کو ہٹا کر وہاں دو اچھی کرسیاں رکھی جا سکتی ہیں یا نہیں ، اس پر غور کیا ۔

گرین آیا تھا ۔ شاکیہ کو دینے کے لیے ایک ہزار روپے انوپما کے سپرد کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ بھابی ، پھوپھا جی سے کہنا بوقت ضرورت کبھی کبھی میری مدد کرتے رہا کریں ۔ ان کی پونجی پر یہ منافع دے رہا ہوں ۔

اس نے گرین کو چائے پلا کر رخصت کیا ۔ چاہے جو بھی ہو گرین بالکل ہی احسان فراموش نہیں بن گیا ہے ۔ شاکیہ کے احسان کو وہ بھولا نہیں ہے ۔ اس کا چہرہ کچھ دنوں میں اور کھل اٹھا ہے ۔ خوش پوشی کے ساتھ ساتھ چال ڈھال میں سنجیدگی اور بات چیت میں کافی مہذب ہو گیا ہے ۔ اس نے سوچا ، گاؤں کے ادنیٰ کسان کا لڑکا ہو کر بھی اپنی محنت سے گریندر ترقی کرتا جا رہا ہے ۔ موقع کا فائدہ

اٹھاکر وہ دنیاکو آئینہ دکھار ہا ہے۔اس کے لیے تو اس کی تعریف ہونی ہی چاہئیے۔

نظام سائیکل کی مرمت کے پیسے لینے آیا تھا۔ ہر مہینے وہ ایک آدھ بار آیا ہی کرتا ہے۔ انوپما نے سنا، نظام کہہ رہا تھا ——
" سمجھتے ہیں باکھر دادا، لگتا ہے ہم نے غلطی ہی کی، اگر اس وقت ہزار روپے جمع کر لیتے تو جنگ کے بعد ایک بڑی سی دکان کھول لیتے۔"
باکھر بولا ——
" ایک بات ہے نظام، ہمیں دیکھنا ہے کہ کون آدمی کتنی دولت کماتا ہے؟ اور کمائی ہوئی دولت سے وہ کیسا انسان بنتا ہے؟ سب لوگ اگر روپے کمانے میں ہی لگ جائیں گے تو اندازہ کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔"
" ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔" نظام نے قہقہہ لگا کر کہا۔
انوپما وہاں سے ہٹ گئی۔ شاکیہ کے ہاتھ میں ایک ہزار روپے تھما کر کہا ——
" پتاجی! گرین یہ ایک ہزار روپے دے گیا ہے۔ کہا ہے کہ آپ کے منافع کا حصّہ ہے۔"
شاکیہ کچھ متعجب ہوئے۔ پاپی گرین کا روپیہ لینے میں انہیں کچھ تامل ہوا تھا
انوپما بولی ——
" پتاجی، پورٹیکو کی بیچ برسات کے پانی کی بوچھار سے بالکل برباد ہوگئی ہے۔ کیا دو چار نئی کرسیاں نہیں لائی جا سکتی ہیں۔ کھلے پورٹیکو میں بانس کی ٹٹیاں لگادینا بھی اچھا ہوگا۔"
شاکیہ نے کچھ سوچنے کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ——
" ہاں بیٹی! بات تو غلط نہیں ہے۔ کتنے معزز افراد آتے ہیں۔ یہ سب دیکھنے میں بھی بھدّے ہو گئے ہیں۔ ٹھیک ہے، میں کل ہی کچھ کرسیوں کا آرڈر دے دوں گا۔"
انوپما نے ایک گلاس شربت شاکیہ کے سامنے رکھ کر کہا ——
" آفس میں کیا پردہ بنانے کے لائق کوئی کپڑا نہیں ہے پتاجی؟ ہمارے

دو، دور ہیں تو اچھا ہے۔"

"او، کپڑے تو کافی ہیں! پردے چاہئیں یا کیا چاہیے۔ اگر مجھے یاد رہے تب تو، ٹھیک ہے کل ہی ایک بھیج دوں گا۔ پر باکھر تو ان سب پر توجہ ہی نہیں کرتا۔"

بہو کی باتوں کو وہ فوری طور پر درست مان لیتے۔ سچ مچ، مکان کو اگر کچھ سجا کر رکھے تو اچھا ہی لگے گا! حالانکہ اس میں کچھ روپے خرچ ہوں گے۔ گرین کے روپے؟ بڑے آدمی کے روپے ــــ

انوپما بولی ــــ

"میں نے جس قدر محسوس کیا ہے، گرین بالکل تو برا نہیں ہے۔ آج جب آیا تھا تو بولا، ضرورت پڑے پر پھر آپ کو اس کی مدد کرنی ہوگی۔ آپ کی فرماں برداری کرنا وہ بھولا نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے بات اس طور پر کہی۔"

شاکیہ نے سوچ کر دیکھا ــــ ہاں، انوپما کی بات درست ہی ہے۔ نہیں تو کاروبار کا منافع بتا کر ایک ہزار روپے کبھی نہ دیے ہوتے۔ ضرورت پڑے پر وہ پھر اس کی مدد کریں گے۔ اس کے علاوہ بکس سے دو چار دنوں کے لیے روپے نکال کر دینے پر ہی اگر چار پانچ گنا فائدہ ہو جائے تو پھر نقصان کیا ہے؟ کاروبار میں کیا گناہ؟ ایسا ہوتا تو تمام کاروبار ہی گناہ ہو جاتے۔

مگر انوپما کی باتوں کا لہجہ ہی آج دوسرا تھا۔ شاکیہ نے محسوس کیا کہ کسی سلسلے میں چوٹ لگنے کی وجہ سے ہی وہ اس طرح کی معنی خیز اور سنجیدہ باتیں کہہ رہی ہے۔ انہوں نے سوچا باکھر سے کچھ جھگڑا وغیرہ ہوا ہے شاید۔

بھیم کسی سے کچھ بات کیے بغیر چپ چاپ کام کرتا رہتا۔ رات کو لالٹین جلا کر لکھنا اور کتاب پڑھنا۔ جو بات سمجھ میں نہیں آتی باکھر سے پوچھ لیتا۔ اس کے دل پر کاری ضرب لگی تھی۔ اس کی بیوی کو ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ اس کی عزت و آبرو سب خاک میں ملا کر ختم کر دی۔ جنگ کی آندھی میں اس کی گوری کہیں اڑ گئی۔ اس کا دوست دریودھن بھی اب انہیں بڑے کاموں میں لگ گیا ہے۔ وہ اب کتنے دنوں تک بااصول نوجوان بنا رہے گا۔ بھیم سوچنے لگا۔ اسے سب چھوڑ گئے۔ صرف باکھر بھیا ہی ایسے ہیں جو اسے پیار کرتے ہیں۔ باکھر کو چھوڑ کر وہ جا نہیں

سکتا۔ دنیا میں پاپ، پنپ کیا ہے۔ یہ تو باکھر نے ہی اُسے بنایا ہے۔ باکھر نے ہی اسے لکھنا پڑھنا سکھایا ہے۔ باکھر میں اس کا اٹوٹ اعتماد ہے۔ گوری چلی جائے لیکن وہ اپنا راستہ ترک نہیں کر سکتا۔

بے چین انوپما کی نظر بھیم پر پڑی۔ بے چارہ سچ مچ دکھی ہے ورنہ ایسا زندہ دل آدمی اتنا سنجیدہ نہیں رہ سکتا۔

باکھر بھی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بھیم کے لیے اس کا دل ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہو جاتا۔ لیکن انوپما کے اس طرح خاموش اور افسردہ رہنے کو وہ کوئی معنی پہنا نہیں سکا تھا۔ گھر کے سارے کام وہ پہلے ہی کی طرح کرتی تھی۔ لیکن دو چار دنوں سے وہ خود اعتمادی اس میں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ جب کبھی گھر آتا، دیکھتا کہ انوپما کچھ نہ کچھ سلائی کا کام لیے بیٹھی ہے۔ لیکن اس کا چہرہ افسردہ ہے۔

چند ہی دنوں کے اندر رشا کیہ نے پانچ کرسیاں، دو میزیں، دو تپائیاں اور ایک کپڑے کا تھان لاکر انوپما کو دیا اور تین آدمی آکر پورٹیکو میں لمبے لمبے بانسوں کی ٹٹیاں بنانے لگے۔ ٹٹیوں پر ہرا رنگ لگایا گیا۔ انوپما نے پورٹیکو میں نئے ڈھنگ سے میز کرسیاں سجا دیں۔ سب سے اچھا میز پوش وہاں لگا دیا۔ نیا پردہ بھی سی کر لگا دیا۔ کچھ بیلوں کے پودے ٹٹیوں پر چڑھانے کے لیے لگا دیے۔

رینو اور گری آئی تھیں۔ انوپما ان سے اچھا برتاؤ نہ کر سکی۔ اپنے اندر ایک حسد کا جذبہ لیے رہی۔ اسی وجہ سے ان سے پیار نہیں جتا سکی۔ وہ امیر ہیں، ان کے ساتھ اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ لیکن انوپما ان کے آگے جھکی نہیں رہ سکتی۔ ان کے عیش و عشرت کے احساس سے خود کو سزا نہیں دے سکتی۔ رینو سے وہ کانٹا، چمچے کا سبق نہیں لے سکتی۔ اس کی بھی ویسی ہی حکومت ہے جس پر وہ فخر کر سکتی ہے۔ گری وغیرہ کے ساتھ ساتھ وہ قدم نہیں بڑھا سکتی تو اس کا اپنا قصور نہیں بلکہ اس کے پتی کے آدرش کا ہے۔ اگر باکھر لوگوں سے پیار کرنا چھوڑ کر روپیہ کمانے میں جٹ پڑتا تو وہ بھی دو منزلہ مکان بنا کر موٹر دوڑا سکتی تھی۔ جانے دو، دو منزلہ مکان نہیں ہے تو کیا ہوا؟ وہ اس کے لیے کسی کی

احسان مند تو نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے گری نے جب ڈنڈما چلنے کی دعوت دی تو اس نے ٹھکرادی۔ رینو وغیرہ کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔

کئی دنوں تک انوپما کی افسردگی ختم نہیں ہوئی تو باکھر فکر مند ہوگیا۔ اس نے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ ایک دن شام کو اسکول سے آکر اس نے دیکھا، انوپما ایک کھڑکی میں بیٹھی اداس نظروں سے خلاء میں ایک ٹک دیکھے جارہی ہے۔ قدموں کی چاپ سے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہوا وہ اندر چلا گیا۔

انوپما نے چائے ناشتہ لاکر رکھ دیا۔ باکھر نے پوچھا ——

"گگی، سنا ہے گرین درمیان میں آیا کرتا ہے۔ ہے نا"؟

اس نے کسی طرح کی حیرت ظاہر کیے بغیر کہا ——

"ہاں، آتا تو ہے۔ کیا آپ سے ملاقات نہیں ہوتی"؟

"نہیں تو۔ لیکن ہمارے یہاں اس کے آنے کی کوئی وجہ تو مجھے نظر نہیں آتی۔"

"کیوں ؟"

"وہ جس ڈھنگ سے ہماری بدنامی کراکر گیا ہے۔ اس کے بعد یہاں اس کے آنے کی کیا کوئی ضرورت ہے"؟

انوپما نے دھیرے سے کہا ——

"کہہ نہیں سکتی۔ مگر پتاجی گرین کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں۔ روپیہ لگاکر انہیں منافع کا حصّہ ملتا ہے۔ وہ پتاجی کو دھوکہ نہ دے کر انہیں منافع کی رقم دیتا آرہا ہے۔ یہ غور کرنے کی بات ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے کچھ برا کام کیا ہو لیکن اسے بالکل ہی برا نہیں کہہ سکتے۔"

باکھر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گگی کی بات غور طلب تھی۔ گرین کا ایک پہلو برا ہو سکتا ہے لیکن پتاجی کے تئیں اس نے احسان فراموشی نہیں کی ہے۔ گرین میں خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن اس کے اندر کا 'گریلا' اب تک برا نہیں ہے۔ اگر گوری نہ ہوتی تو شاید اس کی زندگی کا وہ برا پہلو کسی کو نظر ہی نہیں آتا۔ شاکیہ کا رشوت خور پہلو تو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔

لیکن انوپما کے لہجے نے اسے خاموش نہیں رہنے دیا۔ رات کو اس نے

کھل کر بات پوچھ ڈالی۔ کھانا کھانے کے بعد کھلی کھڑکی کے نزدیک بیٹھ کر ایک کپڑے پر بوٹے کاڑھ رہی تھی۔ باکھر ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ شاکیہ سو رہے تھے۔ باکھر نے پوچھا ـــــ

"تمہیں کیا ہوا ہے گگی"؟

بوٹے کاڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے۔ کچھ بھی کہا نہیں۔

اس نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا ـــــ

"میں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں کہ تم اداس رہتی ہو۔ کیا سوچ رہی ہو مجھے بھی علم نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی پوچھنا چاہا تھا لیکن یونہی دو ایک دن طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی سوچ کر خاموش رہا مگر اتنے دنوں سے افسردہ دیکھ کر پوچھے بغیر رہا بھی نہیں گیا"۔

"بھلا کہاں کیا ہوا ہے آپ کی نظر میں؟ کچھ بھی تو نہیں ہوا"۔ کہہ کر انوپما پھر بوٹے کاڑھنے میں لگ گئی۔

باکھر اٹھ کر انوپما کے سامنے کھڑا ہوگیا اور بولا ـــــ

"گگی! تم مجھ سے باتیں چھپا نہیں سکتیں۔ زبان سے کچھ بھی نہ کہنے کے باوجود تمہاری آواز، چال ڈھال سب سے محسوس ہوتا ہے کہ کچھ بات ضرور ہے"۔

انوپما نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ باکھر کی آنکھوں سے امڈتے ہوئے بے تاب جذبات محسوس کر کے وہ کانپ گئی۔ اس کا دیوتا اس کا درد اپنے دل میں محسوس کرتا آیا ہے۔ آج سے نہیں، پہلے پہل جس دن سے اپنے آپ کو پہچان سکا ہے اسی دن سے۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور پھر سے بوٹے کاڑھنے میں لگ گئی۔ باکھر نے اس کپڑے کو کھینچ کر میز پر رکھ دیا اور اس کا ہاتھ پکڑا ـــــ

"گگی کہتی کیوں نہیں۔ تمہیں کون سا دکھ ہے؟ میرے من کو دکھ پہنچا کر کیا تمہیں اچھا لگتا ہے"؟

انوپما اس کے سینے پر سر رکھ کر رو پڑی۔ اپنے دیوتا کو دکھ پہنچا کر کیا اُسے اچھا لگے گا؟ اس سے تو اس کی موت ہی اچھی تھی۔ گرم پیار کے لمس سے اسے رونے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔ کیسے سمجھائے وہ کہ اس کا درد کیا ہے؟ سمجھانے کی

کوشش کرنے کے بعد بھی تو باکھر مطمئن نہیں ہو پائے گا۔ باکھر مطمئن نہ ہو تو اسے بھی سکون نہیں مل سکتا۔

باکھر نے ہاتھ بڑھا کر بتی بجھا دی۔ الوپما کو پیار سے بانہوں میں بھر کر وہ اس کی ابھری بانہوں کو سہلانے لگا۔ الوپما پھوٹ پڑی۔ پیار بھرے اس سینے پر اس نے آنسوؤں کی ندی بہا دی۔ اتنے پیار سے بھی وہ مطمئن کیوں نہیں ہو پائی ہے ؟ باکھر کے پیار بھرے ہاتھوں کے لمس سے اسے جھرجھری آگئی۔ ایسا شوہر جو دل کھول کر پیار لٹا سکے کتنی تپسیا کے بعد ملتا ہے۔

باکھر بولا ـــــ

"گکی۔ پیاری گکی! چھی، روؤ مت۔ میں شاید تم سے نہیں پوچھتا لیکن تمہاری اداسی دیکھ کر میں برداشت نہیں کر سکا۔ میری زندگی میں آکر تم دکھ پاؤ یہ میں سہہ نہیں سکتا۔ میرے ساتھ رہ کر یا اس مکان میں رہ کر اگر تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو اسے دور کرنا میرا سب سے پہلا فرض ہے۔"

مگر اپنے دکھ کی بات تو وہ مر جانے پر بھی بتا نہیں سکتی حالانکہ باکھر کو جواب دیئے بغیر بھی نہیں ٹالا جا سکتا۔ اس کا درد تو چھپانے سے چھپنے والا نہیں ہے۔ سِسک سِسک کر کسی طرح سے اس نے کہا ـــــ

"کیسے سمجھاؤں کہ مجھے کیا ہو گیا ہے ؟"

"کیا ہوا ہے، یہی بتا دینا کافی ہے۔ میں کوئی نادان تو نہیں ہوں نا ؟"

الوپما نے اور کچھ دیر روتے رہنے کے بعد کہا ـــــ

"میں۔ - - - میں ماں بننے والی ہوں" !

باکھر کا دل خوشی سے بھر گیا۔ ماں، گکی ماں بننے والی ہے! تو پھر اس کے دکھ کی اور کوئی وجہ نہیں ؟ اس نے اور بھی پیار سے گکی کو اپنی بانہوں میں بھر کر کہا۔
"گکی، معاف کرنا۔ مجھے اس بات پر پہلے سے توجہ دینی چاہیے تھی مگر اس کے لیے یوں اداس رہنے کی کیا وجہ ہے ؟ ہوں ؟ مجھے پہلے ہی بتا دیتیں! تم بڑی ...ہ ہو ؟

وہ اور زوروں سے رو پڑی۔ زندگی میں اس طرح کا فریب کرنا پڑے گا۔ یہ بات اس نے سوچی تک نہ تھی۔ وہ ماں بنے گی، یہ درست ہے، مگر یہ تو اس

کے دکھ کی وجہ نہیں ہے۔ پر آج اسی کو بہانہ بنانا پڑا ہے۔

دوسرے دن سے باکھر مصروف ہوگیا۔ بھیم کے توسط سے پتا جی تک یہ بات پہنچائی اور ایک باورچی رکھنے کو کہا۔ شاکیہ بھی فکر مند ہو گئے۔ انوپما کو آتے ہوئے بھی تو چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ بات تو پہلے ہی نظر میں آنی چاہئے تھی۔ تجربہ کار بوڑھے شاکیہ ایسی غلطی ہو جانے کے باعث اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے۔ انہوں نے جلد باکھر کو ایک باورچی تلاش کرنے کو کہا۔

باکھر نے گھومنا پھرنا بند کر دیا۔ انوپما کو پاس بٹھا کر وہ طرح طرح کی باتیں کرتا اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ حاملہ عورت کو کس طرح سے رہنا چاہیے اور ماں کی ذہنی کیفیت سے کیسی اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی موضوع کی کتابیں لاکر پڑھا کرتا۔ وہ ذہن کی پراگندگی کو فراموش کرنے کی کوشش کرتا۔ باکھر پاس رہتا تو وہ ساری دنیا کو بھول رہ سکتی تھی۔ لیکن اس کے کام پر جاتے ہی وہ ذہنی کوفت میں دن گزارتی۔ اسے خوف ہوتا کہ اس کے پیٹ کا بچہ بھی اسی کی طرح دکھی نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو یہ باکھر کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ باکھر نے تو کوئی ایسی ناانصافی نہیں کی کہ وہ اس کے بدلے میں اسے ایسی منحوس اولاد کا تحفہ دے۔

ایک باورچی آگیا۔ اب انوپما کو کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا تھا۔ مگر اس سے انوپما کے ذہنی انتشار میں اضافہ ہی ہوا۔ اب بھی باکھر کے اسکول سے نہ لوٹنے تک وہ فکر مند اور اداس رہتی۔ بھیم اگر اچھا رہتا تو وہ اس کے ساتھ بھی بات چیت کرتی رہ سکتی تھی۔ مگر وہ بھی تو جنگِ عظیم کے خوفناک پنجے میں پھنس گیا ہے۔

باکھر نے دیکھا، دریودھن بھی بھیم کے پاس آیا کرتا ہے۔ وہ بھی کھو نہیں گیا ہے۔ انوپما ٹھیک ہی کہتی ہے۔ گرین کا ایک اچھا پہلو بھی ہے۔

دریودھن اپنے دوست بھیم کو تسلی دینے کے لیے کبھی کبھی آیا کرتا ہے۔ بھیم کو وہ پسند کرتا ہے۔ اس کے علاوہ گوری کے ساتھ شادی کرنے کا بہت حد تک وہ ذمے دار تھا۔ ان دونوں کو ملانے کے لیے اس نے کم شاطرانہ چالیں نہیں چلیں تھیں۔ بھیم تو ٹھگا ہی گیا ہے۔ وہ بھی کچھ حد تک ٹھگا گیا ہے۔

گوری ایسی ہو گی یہ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ بھیم کے لیے وہ ہمدردی رکھتا ہے اس لیے کبھی کبھی آکر وہ بھیم کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے۔

پہلے والا بھیم اب واپس نہیں آسکتا۔ وہ جیسے کہیں کھو گیا ہے۔ وہ دریودھن کو پسند نہ کرتا ہو، ایسی بات نہیں مگر وہ ہنس ہنس کر باتیں نہیں کر پاتا۔ ایک اونچا آدرش لے کر زندگی کے راستے پر اس نے قدم بڑھائے تھے۔ لیکن گوری راستے میں رخنہ ڈال کر چلی گئی۔ پھر بھی اس نے اپنا راستہ نہیں چھوڑا۔ اسی وجہ سے پہلے کی سی خوشی واپس نہیں آئی۔

پھر دریودھن بھی تو کچھ بدل گیا ہے۔ گورے سپاہیوں سے لائن کی حفاظت کے لیے وہ دونوں ساتھ پہرہ دیا کرتے تھے۔ ان دنوں وہ سپاہیوں کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ سپاہی ان دنوں دریودھن کے سخت دشمن تھے۔ مگر اب تو وہ سپاہی کی نوکری کر رہا ہے۔ پیسے کافی ملتے ہیں۔ درمیان میں بخشش بھی مل جاتی ہے۔ چند دنوں کی حاضری لکھوانے کے لیے چار پانچ روپے رشوت دینے پر کبھی کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ سپاہیوں کے آداب اسے اچھے لگنے لگے ہیں۔ صبح ملٹری ٹرک سے کام پر جانا، آنکھیں دبا کر اشارے کرنے والے زبردست سپاہیوں سے چیونگم اور سگریٹ مانگ لینا، دوپہر کو میس ہال میں کھانا، پھر شام کو ٹرک پر ہی گھر واپس آجانا۔ یہی روزانہ کا معمول تھا۔ بڑی بے فکری سے دن گزر رہے تھے حالانکہ اسے بھیم کی یاد آیا کرتی ہے۔ بھیم ملٹری کا کام نہیں کرتا۔ وہ سپاہیوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ سپاہی اور ان کے کام لوگوں کو برباد کر دیں گے۔ بھیم کو اس بات کا پورا یقین ہے۔ صحیح طور پر سمجھ نہ پانے کے باوجود کبھی دریودھن بھی اس اصول پر اعتماد کرتا تھا پر اب تو وہ ان سب باتوں کو نظر انداز کر کے سپاہیوں کے کاموں میں لگ گیا ہے۔ وہ خراب ہو گیا ہے یا نہیں، بھیم کبھی کبھی یہ سوچا کرتا مگر کچھ فیصلہ نہیں کر پاتا تھا۔

روپے کے لالچ میں وہ کام میں لگا ہے۔ وہ بھیم سے تھوڑی عقیدت رکھتا تھا۔ اس لیے کہ بھیم اب تک لالچ میں نہیں پڑا اور شاید اب پڑے گا بھی نہیں۔

وہ باکھر سے ڈرتا ہے۔ آخر بھیم کا مالک ہے۔ ایک طرح سے باپ ہی ٹھہرا۔ گرین جیسا ادنیٰ آدمی معزز ٹھیکیدار بن کر پیسے والا بن گیا مگر باکھر بابو تو بس وہی

باکھر بابو بنے رہے ۔بھیم ۔زیادہ تنخواہ نہیں لیتا ۔ باکھر بابو اگر چاہتے تو روپوں سے صندوق کے صندوق بھر لیتے ۔ وہ تو بس یہی کہتے ہیں کہ اکیلے رہ کر بھی اسکول جاری رکھیں گے ۔ باپ رے باپ !

پھر دریودھن سوچتا، اگرچہ وہ باکھر سے ڈرتا ہے لیکن اس سے کافی عقیدت بھی رکھتا ہے ۔ وہ بڑے کرانی بابو سے بھی زیادہ اونچا مقام باکھر کو دیتا ہے ۔کیونکہ باکھر اسے دیکھتے ہی مسکرا کر پوچھتا ہے ۔ارے او یودھن ؟ کیوں اچھا ہے نا ؟ ہماری طرف تو آنا ہی چھوڑ دیا تم نے ؟ وہ اس کی بات کی خلاف ورزی کر کے سپاہی کے کاموں میں جا لگا ہے ۔' تو کیا باکھر اس بات کو بھول گیا ؟ اگر باکھر اس وقت چائے پیتا ہوتا تو وہ بہو سے کہتا ـــــــ گی ، ایک کپ چائے دیر دریودھن کو بھی دو ۔ایسا شاندار آدمی خیر جان چائے بگان میں دوسرا نہیں ملے گا ۔

کبھی کبھی باکھر بلو چھتا ـــــــ یودھن ، فیلڈ میں کام کرنا کیسا لگ رہا ہے ؟ وہ کیا جواب دے ؟ حالانکہ اچھا ہی لگ رہا ہے لیکن باکھر بابو سے کہے کہ اچھا لگ رہا ہے تو انہیں برا نہیں لگے گا ؟ ذرا تامل کے بعد جواب دیتا ـــــــ اور بھلا کیسا لگے گا بابو ؟ کام تو سب کام ہی ہے ۔سب ایک جیسا ہوتا ہے ۔

ـــــــ نہیں ، نہیں ۔ مانا کام تو ایک ہی ہے مگر پیسے کافی ملتے ہیں ۔ٹرک سے آتے جاتے ہو، ملٹری یعنی صاحبی کھانا کھاتے ہو ۔ یہ سب کیسا لگتا ہے ؟

وہ سر کھجاتے ہوئے جواب دیتا ـــــــ سب شور وغل بھی کرتے ہیں اور کام بھی ۔اچھا لگتا ہے ۔

ـــــــ ہوں ، اچھا گورے کیسے لگتے ہیں ؟

ـــــــ ٹھیک ہی لگتے ہیں ۔ چائے بگان کے صاحبوں جیسے نہیں ۔سبھی ہمارے ساتھ کام کرتے ہیں ۔

ـــــــ اور نیگرو لوگ ؟

ـــــــ یہ نیگرو بڑے زندہ دل ہوتے ہیں ۔ایک جگہ رہ ہی نہیں سکتے ۔ شاید اسی لیے بہت زبردست پہلوان ہیں ۔

باکھر کہتا ـــــــ تب تو ان کے ساتھ رہ کر تو بھی پہلوان ہو جائے گا ۔

گوری دوسری لڑکیوں کے ساتھ فیلڈ میں پتھر توڑنے جایا کرتی۔ نوجوانوں کے ہجوم کے ساتھ ٹرک پر سوار ہو جاتی۔ منہ میں بھرا ہوا تامول، سر پر بندھا ہوا رومال جس کی گرہ پیشانی پر، کمر میں لال انگوچھا۔ لڑکیاں کبھی کبھی کام ختم کر کے جلدی پیدل ہی گھر چلی جاتیں۔ پانچ بجے تک ٹرک آنے کا انتظار نہیں کرتیں۔ دن کے اجالے میں ملٹری مینوں سے وہ اتنا ڈرتی نہیں۔ حالانکہ سبھی سپاہی بدمعاش نہیں ہوتے۔ کچھ ہی ہوتے ہیں جو دیکھتے ہی آنکھ دبا دیتے ہیں لیکن کچھ تو بڑے ہی شریف ہیں، ایک نیگرو سارجنٹ ہے، بے حد نرم لہجے میں باتیں کرتا ہے۔ فوٹو کھینچتا ہے، گھر کے حالات بتاتا ہے۔ گوری سے اس کی آمدنی اور گھر کے حالات دریافت کرتا ہے۔ فوٹو کھینچنے کے بعد پیسے دے کر چلا جاتا ہے۔ اتنے بھلے انسان ہوں تو سپاہی چاہے جتنے زبردست ہو جائیں ان سے ڈرنے کو جی ہی نہیں چاہے گا۔

ایک بات اور تھی۔ زیادہ تر سپاہی گوری سے ہمدردی کرتے۔ اس سے اپنائیت بھرے لہجے میں باتیں کرتے۔ سگریٹ دیتے، بخشش دیتے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس کے دل کی تھاہ لینا چاہتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ گوری کے دل میں جو خوف بیٹھا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔

کبھی کبھی جلدی چھٹی ہو جانے پر پیدل جاتے ہوئے وہ بازار میں باگھر کو دیکھتی لیکن سر جھکا کر نکل جاتی۔ باگھر اس کی طرف دیکھتا۔ گوری کو محسوس ہوتا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر اسے تامل ہوتا۔ اسی وجہ سے باگھر کی طرف متوجہ ہوئے بغیر وہ آگے بڑھ جاتی۔

گرین سے اس کی ہمیشہ ملاقات ہوتی۔ وہ کم سے کم ایک بار تو ضرور ہی اس کے پاس آتا۔ فیلڈ میں گرین کو دیکھ کر اسے اچھا لگتا۔ جیسے سپاہیوں کے جھنڈ میں اسے ایک ہمدرد مل جاتا۔ گرین اس کا عاشق ہے، وہ اسے پسند کرتا ہے۔ وہ سوچتی، میں دنیا بھر میں یوں آزادانہ گھوم رہی ہوں ورنہ لائن میں تو اس بار ھومتی کی طرح ملٹری سپاہیوں کے خوف سے اس کی بھی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ اس وقت وہ دریودھن و بھیم کے سائے میں پناہ تلاش کرتی تھی۔ بھیم کی بات وہ بھولی نہ تھی۔

بھولتی بھی کیسے ؟ کچھ بھی ہو، اس کے اندر کی عورت کو سب سے پہلے اسی نے بیدار کیا تھا۔ کبھی وہ اسے پیار بھی کرتی تھی۔ لیکن اب وہ بھیم سے نفرت کرتی ہے۔ دنیا بھر کے عیش و آرام سے خود کو محروم رکھنے والے بھیم کو وہ کسی طرح پسند نہیں کر سکتی۔ مہینے میں ساٹھ اور اسّی تک وہ خود کما لیتی۔ باپ اسی وجہ سے اس کی کافی قدر کرتا۔ لیکن اگر وہ بھیم کے ساتھ رہتی تو کیا یہ سب ہو سکتا تھا۔ ان سب کے لیے دل ہی دل میں وہ گرین کے تئیں تشکر کا اظہار کرتی رہتی۔ بھیم نے اسے دریافت کیا تھا محض گرین کی تفریح طبع کے لیے۔ گرین اسے کلیا پانی والے اپنے گھر میں بلایا کرتا مگر وہ نہیں جاتی۔ دن کو جانا ناممکن تھا۔ رات کو بھلا لائن کے باہر کیسے رہ سکتی تھی۔ حالانکہ گرین کے لیے اس کے دل میں محبت کا جذبہ تھا۔ اس کی خواہش ہوتی کہ وہ گرین کو پیار کرے لیکن اس کا موقع کہاں ؟

حالانکہ ایک رات کو وہ کافی دیر تک گرین کے یہاں رہی۔ ڈنڈما میں سینما دیکھنے کے لیے لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی آتی تھی۔ گرین اسے دیکھ کر ایک طرح سے زبردستی ہی لے گیا تھا۔ ایسا موقع تو ہمیشہ قسمت میں نہیں آتا لیکن اپنی کیفیت اس نے گرین کو بخوبی سمجھا دی تھی۔ وہ بھی صبر کر کے موقع کا انتظار کرتا رہا۔

ٹرک پر گوری وغیرہ کو لائن میں پہنچاتے گرین کو باکھر نے کئی روز دیکھا ہے۔ گرین سے ملاقات ہونے پر بھی اس کی بات کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ گرین کے لیے وہ قطعی ہمدردی نہیں رکھتا۔ گرین بھی باکھر کی غیر موجودگی میں ہی اس کے یہاں جاتا حالانکہ راستے میں کہیں ملاقات ہونے پر گرین ہی آگے بڑھ کر آواز دیتا۔

ایک دن شام کو اسکول سے گھر پہنچنے پر باکھر نے گرین کو نکلتے دیکھا۔ گرین نے صرف —— اوں، بھیا، یہی بس کچھ کام سے آیا تھا، کہہ کر کھڑے ٹرک پر سوار ہو گیا تھا۔ ٹرک پر بدرالدین اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اسے پتہ چلا، گرین شاکیہ سے روپے لینے آیا تھا۔ پانچ ہزار لے گیا ہے۔ دو ایک دن کے اندر ہی سات ہزار واپس کر دے گا۔ گرین یہ کاروبار لگاتار چلائے جا رہا تھا۔ اسے مزدوروں کو تنخواہ دینے میں کبھی کبھی روپوں کی کمی ہو جاتی

اس وجہ سے شاکیہ کے پاس آنا پڑتا۔ شاکیہ جہاں تک ہو سکے باکھرے سے بتائے بغیر کاروبار میں منافع کماتے رہے ہیں۔ پتاجی بھی اسی راستے پر چلیں گے۔ اس پر اسے حیرت نہیں ہوتی۔ اسے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ وہ اس راستے پر چل نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ راہ اسے پسند نہیں۔

اس نے کہا تھا ــــــ گی، دیکھتا ہوں کہ پتاجی اس عمر میں بھی روپوں کے لالچ سے خود کو آزاد نہیں کر پاتے۔ اب تو انہیں" راکھو راکھو ہری مایا باندھ کھاتا" بھجن گانا چاہیے تھا لیکن وہ تو روپوں کے لالچ میں پڑ کر مکتی کو بھول گئے ہیں۔

گرین نے آکر انوپما کی طبیعت مکدّر کر دی تھی۔ اسے دیکھتے ہی انوپما کے اندر کی عورت جاگ اٹھی۔ اس نے جواب دیا ــــــ

"آپ کو کوئی فکر ہے ہی نہیں۔ پورٹیکو کی بیچ ٹوٹ گئی ہے لیکن آپ کو کیا خبر ہے ؟"

باکھرے نے پہلے سوچا تھا کہ ہنس پڑے کیونکہ انوپما بطور مذاق بھی ایسا کہہ سکتی ہے۔ اس نے بھی لطیف مذاق کے طور پر ہی پتاجی کی بات کہی تھی لیکن انوپما کے لہجے میں مذاق کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس نے یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہی تھی۔ تو کیا یہ اس کے اندر کی آواز ہے ؟ اسے برا لگا۔ کچھ بھی جواب دیے بغیر وہ چائے پینے لگا۔ شاید انوپما داخلی کرب کا شکار ہے۔ اس کے پاس دولت نام کی چیز نہیں ہے۔ وہ عیش و آرام میں پلی لڑکی ٹھہری، کالج کی فضاؤں میں پلی لڑکی۔ نوجوانی کی امنگ میں جانے کیوں باکھرے سے پریم ہو گیا۔ اب زندگی کی بڑھتی ہوئی ضروریات حاصل نہ کر سکنے کے باعث پچھتا رہی ہے۔

وہ اپنے ذہن کا شک مٹانے کے لیے انوپما سے کچھ پوچھ نہیں پاتا۔ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس وقت اس کے دل کو صدمہ پہنچانا اچھا نہیں ہوگا۔ ایسا ذکر اس کے پیٹ میں پلنے والے بچے کے مستقبل کو نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن اسی درمیان اگر وہ فکرمند ہو گئی تب ؟ اسے خوف محسوس ہونے لگتا۔ دل بے چین و بے آرام ہو جاتا۔ پتاجی نے اس کے نام بینک میں جو رقم جمع کر رکھی تھی، اس میں سے کچھ زیادہ روپے نکال کر وہ انوپما کے لیے بلاؤز پیس، صحت بخش

غذائیں اور سینڈل وغیرہ خرید لایا۔

انوپما اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتی۔ باکھر اپنی بساط سے کچھ زیادہ ہی خرچ کر کے اسے خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اس بات سے وہ اپنے کو کوستی اور دل ہی دل میں رویا کرتی۔ اس کے بالوں میں نرم نرم ہاتھوں سے کنگھی کر دیتی۔ وہ کتاب پڑھتا، انوپما سنتی رہتی۔

باکھر کو خوف تھا کہ جنگِ عظیم کے بھیانک ریلے میں کہیں اس کی کشتی بھی تو نہیں بہہ جائے گی؟ گوری بہہ گئی۔ گرین بہہ گیا، پتا جی بہہ گئے۔ انوپما تھی، کیا وہ بھی بہہ جائے گی؟ وہ کس کے ساتھ رہے گا۔؟ بھیم کے ساتھ تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ شادی کے پہلے کے بھیم سے بھی اس کی زیادہ پٹتی نہیں تھی، گوری نے آ کر کچھ ماحول کو بدلا تھا۔ وہ بھیم مر چکا۔ اب اگر انوپما بھی چلی گئی تو وہ کیونکر زندہ رہ سکے گا۔؟

حال کی تیز رو میں لوگ بہے جا رہے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں، کسی کو پتہ نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی بے سکون سمندر میں جا پڑیں۔ لیکن اس کا علم کسی کو نہیں ہے۔ یودھن نے تو ایک دن اسے دیکھ کر بات بھی نہیں کی۔ ایک دن بالکل قریب سے کترا کر نکل گیا۔ ایک دن آنکھوں میں دیکھتا ہوا سگریٹ پیتا نکل گیا۔ نیگرو اور امریکن سپاہیوں کے ساتھ جیپ پر چڑھ کر وہ تنی چلیا۔ ڈبرو گڑھ وغیرہ کے چکر لگاتا رہتا ہے۔ پانی جیسی انگریزی جھاڑا کرتا ہے۔

حالانکہ وہی یودھن اسکول میں اس کا فرمانبردار طالب علم تھا، نرم گفتار جوشیلا، شریف اور محنتی۔ وہ بھی کھو گیا۔

اس کی بے چینی بڑھ گئی۔ وہ تنہا مخالف سمت میں چلا جا رہا ہے۔ پوری دنیا ایک طرف جا رہی ہے۔ اس لیے وہ اکثر نظام کے یہاں جاتا۔ نظام کے پاس جانے سے اسے ایک ساتھی مل جاتا۔ لیکن نظام مصروف رہتا۔ اسے دکان چلانی پڑتی۔ اس طرف سے گزرنے والے پھل پھول والوں سے سامان لینے دینے میں مصروف رہنا پڑتا۔ بھیم بھی کبھی کبھی چلا جاتا۔ آخر وہ بھی تو انسان ہے۔ درد کی دلدل میں چلنا پسند کرنے والا دھندا اور گرد کی چلمن کے اس پار کے ہیولے کی طرف دیکھتا اور آنسو بہاتا ہوا ملّاح، قسمت میں کچھ ہے اگر، بیٹھوں گا

تیرے دوار پر، ہاتھ میں لوٹا، چمٹا لے ـــــ گانے والا پریمی بیراگی۔

جس دن باکھر کا اندازہ درست ثابت ہوا، اس دن اس نے سمجھ لیا کہ انوپما کے بارے میں اس نے صرف اندازہ ہی نہیں لگایا تھا، محسوس بھی کیا تھا۔

جنم دن کی خوشی میں گری نے انہیں مدعو کیا تھا۔ خود آ کر ضد کی۔ جانا ہی پڑے گا وہ گاڑی بھیج دے گی۔ مجبور ہو کر ہی باکھر نے حامی بھر دی نہیں تو گری کے عادات و اطوار اسے بھی پسند نہیں تھے۔

انوپما کسی طرح بھی جانے کو تیار نہیں تھی لیکن باکھر نے کسی طرح سمجھا بجھا کر اسے منایا۔ گاڑی آ کر لگی ہی تھی۔ تبھی 'طبیعت اچھی نہیں ہے' کہہ کر انوپما نے 'نہیں جاؤں گی' کہا تھا۔ باکھر کے بہت کہنے سننے پر ہی وہ باہر نکلی۔

پھول پتوں سے مکان کو سجایا گیا تھا۔ پورے علاقے کے لوگ جمع تھے۔ نرکانت بروا کی بڑی لڑکی کا جنم دن! زندگی کے اٹھارہ سال بیت چکے۔ اب جا کر آج گری بالا پہلی بار جنم دن منا رہی ہے۔ شاید اسی بار اس کا جنم اس دنیا میں ہوا ہے جس میں وہ پہلی بار داخل ہو رہی ہے۔ نرکانت بروا نے تو کسی زمانے میں جنم دن نہیں منایا ہے۔ بروانی نے بھی پہلی بار سنا کہ ایسا بھی کوئی دن ہوتا ہے۔ ریبو کا جنم دن منایا جائے گا یا نہیں، پتہ نہیں۔

کئی اونچے عہدوں والے ملٹری افسر آ پہنچے تھے۔ جینت اچانک کہیں سے نکل آیا۔ گری کا ہونے والا شوہر جینت۔ ہندوستانی سپاہی کی وردی میں سجا ہوا تندرست نوجوان، ہٹے کٹے امریکی سپاہیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ڈیوڈ بھی آیا تھا۔ باکھر کو دیکھتے ہی اٹھ کر اسے بانہوں میں بھر لیا۔ نرکانت بروا کے ہونے والے داماد سے تعارف کروا دیا۔ گرین اور بدرالدین بھی آئے تھے۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھے لگاتار سگریٹ پی رہے تھے۔ انسانوں کو قتل کرنے والے سپاہی، رشوت دے کر بل پاس کرانے والے ٹھیکیدار، بدعنوان، بدکردار نوجوان، غرور سے اکڑے ہوئے نودولتیے، ان کے درمیان آ کر باکھر ہنس پڑا۔ اتنے مختلف مزاج والے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر ہنس بول سکتے ہیں، تعجب ہے۔ ہاں، آدمی سماجی جانور ہے، جانور بھی، سماجی بھی۔

نفیس کپڑوں میں ملبوس گری سب کو بلا بلا کر بٹھا رہی تھی۔ اس کے پیر جوتے چپلوں سے عاری تھے۔ بلاؤز کا کپڑا ایجنٹ نے ولایت سے لا دیا تھا۔ رینو کا فراک بھی ولایتی کپڑے کا تھا۔ گری کی ولایتی وائل کی چادر بلیک مارکیٹ سے دس روپے گز کے حساب سے خریدی گئی تھی۔

چائے کے لیے بیٹھتے ہی انوپما کو کانٹا چمچہ پکڑنے کے سبق کی بات یاد آ گئی۔ اس کا سینہ دھڑک اٹھا۔ ترکا نت بردا کے گھر کے سامانِ عیش و عشرت نے اس کے اندر کی بے سکون روح کو بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے اسّی نمبر والے سوت سے گھر میں بنی ہوئی چیلیں (بوٹے دار لباس) پہن رکھا تھا۔ رینو اور گری کے خالص ولایتی لباس دیکھ کر وہ اپنے کو قابو میں نہیں رکھ سکی، بے قابو ہو گئی۔ وہ زبردستی ہنس بھی نہیں پاتی تھی۔

ہاتھ سے پھسل کر گری کے چائے کا کپ پلیٹ پر گر پڑا۔ اس کی بلیک مارکیٹ والی دس روپے گز کی ولایتی چادر پر چائے گری۔ وہ اٹھ کر اسس، اسس، کرنا کے سکوڑتی اندر گئی اور پانچ منٹ کے اندر ہی بالکل ویسی ہی ایک چادر لے کر چلی آئی۔ چائے کی میز پر بیٹھی انوپما اپنی چیلیں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ گری نے گھر میں بنی ہوئی انوپما کی چیلیں کی طرف یونہی ایک بار نظر ڈالی اور کہا —— چائے کا داغ شاید نہیں مٹے گا۔ انوپما کو غصہ آ گیا۔ وہ کیوں اس کی طرف دیکھے گی؟

رینو نے پوچھا ——

"بھابی کی چادر تو گھر کی بنی ہوئی ہے نا؟"

انوپما کا تن جل اٹھا۔ چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ شاید گری نے اندازہ کر لیا۔ اس نے ہنس کر کہا ——

"اری خود کی بنی ہوئی چادر اوڑھنا فخر کی بات ہے۔ شرم آتی ہے —— کرگھا چلانا نہیں سیکھا۔ نکمی بنی رہی۔"

انوپما نے محسوس کیا کہ گری کی باتیں اس پر کیے گئے طنز کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ وہ شرم کے مارے کٹ کر رہ گئی۔ کب گھر جا سکتی ہے؟ اسی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ بھلا یہاں مرنے کیوں آئی؟

چائے ناشتے کے بعد تحفے تحائف دینے اور شکریہ ادا کرنے کے بعد مہمانوں کی موجودگی میں ارخن کے سامنے بیٹھ کر گرہی نے گانا گایا۔ درمیان میں بیٹھے جینت کو دیکھتی ہوئی وہ شرما کر ہنس پڑتی۔ جینت سر ہلاتا۔ رینو ناچتی اور انوپما ؟ اس کے ذہن میں طوفان برپا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے گرہی کے جنم دن کی تقریب اس کا مذاق اڑانے اور اسے نیچا دکھانے کے لیے ہی منعقد کی گئی ہے۔ نفیس شطرنجی پر رکھے ہوئے صوفے، کرسی، میز، دیواروں پر کی بڑی بڑی روغنی تصویریں، دروازوں جیسی بڑی بڑی کھڑکیوں پر جالی دار پردے، تپائیوں پر تازہ پھولوں کے گلدستے! سبھی جیسے اس پر طنز کر رہے ہیں۔ باکھر نے اس کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ اس کا مقصد تھا کہ انوپما خود کو ماحول سے ہم آہنگ کرے، آداب محفل کا خیال رکھے اور سرکش جذبات میں نہ بہے —— وہ سر اٹھا کر بے چینی سے رینو کا ناچ دیکھنے لگا

تندرست و توانا نوجوان جینت کے پر مسرت و پرکشش چہرے کے سامنے باکھر کا غیر صحت مند اور کڑی محنت کی چھاپ والا چہرہ دھندلا دھندلا سا ہو گیا تھا۔

راستے میں انوپما نے باکھر سے ایک بار بھی بات نہیں کی۔ رات کو شاکیہ کے سو جانے کے بعد سونے کے لیے دروازہ بند کر کے اس نے بے قابو جذبات کو آزاد کر دیا۔ وہ رو پڑی۔

بے چین باکھر پاس آ گیا —— "کیا ہوا؟"

"مجھے میکے چھوڑ آئیے نا! کافی دنوں سے نہیں گئی۔ جانے کی بہت خواہش ہوتی ہے۔ وہ بے چین ہو اٹھا۔ میکے جانے کے لیے کیا رویا جاتا ہے؟ شادی کے بعد سے اب تک اسے نہ بھیجنا شاید ناانصافی ہے۔ مگر اس نے تو کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ انوپما کو من مانی آزادی تو وہ دیتا ہی آیا ہے۔ اگر اس نے پہلے ہی اس کا اظہار کیا ہوتا تو وہ روکتا تھوڑی ہی۔ وہ آخر اتنی جذباتی کیوں ہو گئی؟ آخر کیوں؟

اس نے کہا ——

"کمّی! گھر جانے کی خواہش ہے تو اس میں تمہارے رونے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھ سے ناانصافی ضرور ہوئی ہے کہ میں نے شادی کے بعد میکے ہو آنے کے لیے کبھی نہیں کہا۔ پھر تم نے ایسا کیوں سوچ لیا کہ میں تمہیں گھر جانے سے روکوں گا؟"

انوپما نے آنچل آنکھوں سے لگا لیا۔ باکھر کہتا گیا ــــــ

"آج تم گری کے یہاں سے من مار کر آئی ہو۔ میں وہاں دیکھ رہا تھا۔ تم کافی جذباتی ہو گئی تھیں۔"

انوپما بولی ـــــ

"وہاں میری کافی بے عزتی ہوئی ہے۔ صرف آج ہی نہیں ایک دن اور بھی۔ رینو وغیرہ مجھے نیچا سمجھتی ہیں۔ ان کا دکھاوا میرے اندر جلن پیدا کرتا ہے۔ ان کے پاس دولت ہے اور عزت بھی۔ میرے پاس نہیں ہے۔ مگر وہ مجھے نیچا کیوں سمجھیں گی وہ ولایت سے لائے کپڑے کا مقابلہ میرے گھر کے بنے کپڑے سے کر کے مجھے نیچا دکھاتی ہیں۔ آپ مجھے دہکتی آگ کے درمیان لے گئے تھے۔"

باکھر چپ چاپ وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ سسکتی رہی۔ کافی دیر بعد اس نے انوپما کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر آرام کرسی پر بٹھا دیا اور کہا ـــــ

"بیٹھو کمّی! خاموش ہو جاؤ۔ میرے چہرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو جاؤ۔"

باکھر اندھیرے میں پورٹیکو میں جا کر تنہا بیٹھ گیا اور دور کے ایک بڑے چمکتے تارے کی طرف اداس نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، گئی، "کمّی" گئی۔ محبت کی ہوا کا وہ آخری جھونکا بھی کہیں جا کر گم ہو گیا۔

کتنی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا، پتہ نہیں، بھڑے ہوئے دروازے کے کھولنے کی آواز سے اس نے مڑ کر دیکھا۔ انوپما۔

تاروں اور جگنوؤں کی ملگجی روشنی میں وہ لمحہ بھر باکھر کی طرف دیکھتی رہی بعد میں دھیرے دھیرے آ کر باکھر کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اس کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ رندھے ہوئے گلے کے باعث وہ کچھ بولنا چاہنے کے باوجود نہیں کہہ سکی۔ باکھر اس کے سر کو ہاتھوں سے سہلانے لگا۔

پھولتی پچکتی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہا ——

"ککی —— چھی، چھی۔ ایسا نہیں کرتے۔"

انوپما نے اس کے بائیں پیر کو بانہوں میں بھر کر داہنا گال اس کے گھٹنے سے لگا دیا۔

انوپما کو پہنچا کر باکھر اور بھیم خیر جان واپس آ گئے۔ دونوں ہی اب تنہا تنہا تھے۔ شاکیہ نے کہا ——

"بہو کچھ مہینے میکے میں ہی رہے تو اچھا ہے۔"

وہ بھی اکیلے پڑ گئے۔ اس بڑے مکان میں تینوں پھر پہلے کی طرح رہنے لگے۔ مگر بھیم کو اب کھانا بنانا نہیں پڑتا، باورچی ہے۔ وہی انہیں احساس دلا دیتا ہے۔ اب وہ پہلے جیسے نہیں رہے۔ گرین، گوری اور انوپما درمیان میں آ کر ان کو دکھ میں ڈال گئے ہیں۔

بھیم اب لائن میں پہرہ دینے نہیں جاتا۔ حفاظت کرنے کے لائق اب کوئی بھی شخص لائن میں نہیں رہا۔ سبھی سپاہیوں کے کام کرتے ہیں۔ سبھی نڈر ہو گئے ہیں۔ کیرتن گھر میں چراغ نہیں جلتا۔ بھگوان شری کرشن کو بھی وہ بھول چکے ہیں۔ اب تو لکشمی کا راج تھا، نارائن بھاگ چکے تھے۔ اس پار کی خواہش اب نہیں رہی۔ اس پار کی مسرتوں میں بھی شریک تھے۔ وہ سورگ میں اب جانا نہیں چاہتے۔ زندگی میں ہی راج محل بنانا چاہتے ہیں۔

سب کچھ کھونے پر بھی باکھر کو لگتا ہے کہ اس نے غلطی نہیں کی ہے۔ نہیں تو اسے بھیم اور نظام کا پیار کبھی نہیں ملتا۔ اسے جیون دادا کی یاد آتی۔ جیون دادا بھی تو جینت کی طرح ملٹری افسر بن کر افریقہ یورپ کی سیر کر سکتے تھے۔ مگر وہ آسام کی پہاڑی گپھاؤں میں پھر رہے ہیں۔ بنگال کے جونکوں اور کیڑے مکوڑے سے بھرے جنگل اور میدانوں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ راجستھان کے ریگستانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ ان چاروں آدمیوں سے ایک ساتھ غلطیاں ہوئی ہیں تو ہوں۔ اس کا نتیجہ ایک ساتھ بھوگنا ہے۔ اور اگر پھول ملے تو اس کا حصہ سبھوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

رخصت ہوتے وقت انوپما نے باکھر سے خط لکھنے کو نہیں کہا تھا۔ وہ خود آگے آکر بولا ——

"میں خود جاتے ہی خط لکھوں گا کئی! تم حسبِ معمول خبر دیتی رہنا اور دیکھو خیال رکھنا کہ مجھے ٹھیک وقت پر خبر ملے۔ میں پاس رہوں گا۔"

کسی طرح کا رنج کیے بغیر اس کی ہمت بندھانے کے لیے وہ برابر خط لکھا کرتا لیکن اس کا خط روایتی ہو جاتا۔ اس سے خلوص کا اظہار نہیں ہوتا۔ انوپما کے خط بھی بے جان اچھی بری خبروں سے بھرے ہوئے ہوتے۔ اب وہ 'پریتم' کے بجائے 'سرتاج' لکھنے لگی تھی۔

باکھر سوچنے لگا —— روپیہ کیسے کمایا جائے؟ ستر روپے کی اسکول ماسٹری کا آدرش آدمی بنے رہنے سے تو کام نہیں چل سکتا۔ شاکیہ کے زیر سایہ رہ کر اسے دست نگر تو نہیں بنے رہنا ہے۔ انوپما کو تو تقریباً کھو ہی چکا۔ اسے واپس لانا ہے۔ مگر کیسے؟

— نرکانت بروا اپدیش دیتے —— باکھر، کچھ تو کرو، ایسے کیونکر چل سکتا ہے، یہ تو تمہیں تسلیم کرنا ہی ہوگا۔ لڑائی کے ٹھیکے کا کام کرنے کا وقت تو ختم ہو گیا ہے۔ پھر بھی ابھی وقت ہے۔ گرین کو تو دیکھ ہی رہے ہو نا؟ کیسی ترقی کر رہا ہے؟ ضرورت ہو تو میں مدد کر دوں گا۔ محنت کرنا شرط ہے۔ گرین اور بدرالدین اس کی مثال ہیں اور میں خود بھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں چاول، دال کی چھوٹی سی دوکان لگایا کرتا تھا۔

لیکن باکھر نے سنا تھا کہ وہ چاول کا بورا کندھے پر لیے چائے بگان میں گھوم گھوم کر بیچا کرتے تھے۔ یہ بات بتانے میں بروا کو شرم آتی ہے۔

کوئی دوکان کرنے کی بات وہ سوچتا۔ لیکن اس کے لیے سرمایہ چاہیے۔ اس کے علاوہ دوکان لگانے کا مطلب ہے سپاہیوں کے لیے سامان فراہم کرنا —— نہیں، نہیں۔ یہ سب نہیں کر سکتا۔ لیکن بغیر سرمایہ کے کون سی تجارت ممکن ہے؟

وہ کتاب لکھنے کی بات سوچتا۔ اسکول کالج وغیرہ میں مضامین لکھ کر اس نے چھپوائے تھے۔ لیکن ناول لکھنے کی صلاحیت اس میں نہیں ہے۔ ضخیم کتاب

لکھنے کی اہلیت بھی نہیں ہے۔

ترجمہ ؛ ہاں ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر وہ کتاب ایسی ہونی چاہیے جسے عام قاری خرید کر اسے دو چار پیسے دے سکے۔ ابھی غیر ملکی کتاب کا ہی وہ ترجمہ کرے گا. جاسوسی ناولوں کے بارے میں وہ سنجیدگی سے سوچتا۔ ڈیوڈ سے مانگ کر وہ ڈھیر سے جاسوسی ناول لے آیا۔ ایک دن ڈبروگڑھ جاکر افسانوی ادب سے متعلق ایک تنقیدی کتاب لے آیا۔ پندرہ دن بعد اس نے اگاتھا کرسٹی اور شرلاک ہومز کی دو کتابیں منتخب کر لیں۔ اگاتھا کرسٹی کی کتاب 'ازی ٹوکل' اسے اچھی لگی۔ لیکن آرتھر کانن ڈائل سے سب واقف ہیں۔ اس لیے شرلاک ہومز کے تقریباً بیس صفحات کا ترجمہ کر کے وہ ڈبروگڑھ کے ایک ناشر کے پاس گیا۔ باکھر کا کوئی قرابت مند تھا۔ گوہاٹی میں کتابوں کی بڑی دوکان تھی، لیکن اس نے ڈبروگڑھ سے بھی کچھ کتابیں شایع کی تھیں۔ ناشر نے باکھر کی ہمت افزائی کی۔ باکھر نے کہا ــــــ

" آپ 'ازی ٹوکل' کی اشاعت کے لیے اصل ناشر سے اجازت لے لیجیے میں اسی درمیان ترجمہ مکمل کر لوں گا۔ معاوضہ کے متعلق بعد میں طے کر لیں گے ۔"

ناشر مان گیا تھا۔

باکھر خوشی خوشی ترجمے کے کام میں لگ گیا۔ اسکول سے لوٹ کر ترجمہ کے کام میں ہی مصروف رہتا۔ وہ اتنے انہماک سے کام کر رہا تھا کہ اپنے سارے دکھ درد بھول گیا تھا۔ اس کے دل میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ ذہن کو یک گونہ سکون مل گیا تھا۔ انو پما کو قریب لے آنے کے لیے اس کا دل بے چین ہو اٹھا۔ وہ روپیہ کمائے گا۔ بغیر کسی تجارت کے، بغیر سرمایے کے اور اس کا دل بھی گناہ سے آلودہ نہیں ہوگا۔ وہ لکی کو سکھی بنائے گا۔ لکی اسے پھر سے پیار کرے گی. وہ سکھی ہوگی۔

اس نے لکی کو لکھا ــــــ

" ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کام تو نہیں کیا ہے لیکن تمہیں سکھی بنانے کا میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ تمہاری جدائی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہاری بے چینی کی وجہ میں جانتا ہوں۔ اپنے کمزور اور اپاہج آدرشوں کو لے کر ہی میں چلتا

رہوں گا۔ لیکن میں دولت کی فراہمی کے لیے نکل پڑا ہوں میں، 'میں ہی رہ کر دولت کماؤں گا۔"
انوپما کا جواب آیا۔" اگر میری بے چینی کی وجہ آپ سمجھ گئے ہیں تو کبھی سکھی نہیں ہو پائیں گے۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا؟ میں امید نہیں کرتی تھی۔ اپنے لاشعور میں چھپی ہوئی عورت کو میں پہلے دیکھ پاتی تو آپ کو کبھی پریشان نہیں کرتی۔ اب تو واپس ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ناانصافی میں کر نہیں سکتی۔ ہمیشہ کے لیے آپ کو اندھیرے میں رکھنا بھی بڑی ناانصافی ہے۔ پتہ نہیں کیوں خیر جان میں میری بے چینی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔"
حوصلہ نہ ہارنے کا عزم کر کے باکھر نے ایک ماہ کے اندر ہی ترجمہ پورا کر کے ناشر کو سونپ دیا۔ اسی جوش سے وہ 'اگاتھا کرسٹی' کے 'ازی ڈکل' کے ترجمہ میں مصروف ہو گیا۔ ناشر نے مطلع کیا کہ کتاب چھپتے ہی اُسے پہلی اشاعت کے لیے پانچ سو روپے دیے جائیں گے۔
'ازی ڈکل' کا ترجمہ نصف تک ہو چکا تھا کہ اس دوران تار ملا۔ کٹی کو بیٹی ہوئی ہے جلد آؤ۔ کاغذات سمیٹ کر وہ گاڑی سے جورہاٹ روانہ ہو گیا۔ کٹی ضرور اُسے دل سے چاہتی ہے۔ اُسے بیٹی ہوئی ہے جس کی خواہش کی تھی وہی ہوئی۔ انوپما نے کوئی ناانصافی نہیں کی۔
تاراجان میں انوپما کے پتاجی کے عالی شان مکان کے سامنے دو موٹریں رُکی ہوئی تھیں ایک ڈاکٹر کی اور دوسری انوپما کے پتا کی۔ نرسوں اور عورتوں کی مصروفیت کے باعث اُسے شام تک انوپما کے پاس جانے کی اجازت نہیں ملی۔ بیٹی ہونے کی وجہ سے عورتیں اتنی خوش نہیں تھیں لیکن، باکھر کے سسر بہت خوش تھے۔
اندھیرا ہونے کے بعد انوپما نے اسے بلا بھیجا۔ نوزائیدہ بچی ایک پالنے میں سو رہی تھی۔ دیکھنے میں بالکل کٹی جیسی، چہرہ باکھر پر گیا تھا۔ اس نے بہت بے صبری سے بیٹی کو دیکھا۔ بے تاب انوپما کے پاس بیٹھتے ہی اس نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی، کہاں تھے اب تک؟ میں نے اتنی تکلیف جھیلی، آپ پاس نہ تھے، آئے اور باہر بیٹھے رہے۔
باکھر کا دل ناچ اٹھا۔" کٹی اتنی ساری عورتیں آ رہی تھیں کہ میں تمہارے پاس آ ہی نہیں پا رہا تھا۔ ناراض نہ ہو۔"
انوپما بستر پر نیم دراز تھی۔ گال منہ سوکھ گئے تھے۔ بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ باکھر نے اس کے سر اور رخساروں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ طرح طرح کی باتیں پوچھیں۔ اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ انوپما نے اس کے سینے میں سر

چھپاتے ہوئے کہا ——

"میں نے اب بھی آپ کے تئیں کوئی ناانصافی نہیں کی ہے۔ آپ کو لڑکی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ایشور نے میری مدد کی ہے۔ آپ کو خوش ہونا ہی ہوگا۔"

اس نے باکھر کو کافی دیر تک اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ ان کے پاس کوئی نہیں آیا۔ دوسرے دن زچہ کافی حد تک صحت مند ہوگئی۔ باکھر کے اس اثر سے سب کو حیرت بھی ہوئی۔ اسے فخر کا احساس ہوا —— وہ نہا دھو کر بال سنوار کر باہر آنے جانے لگی۔ افسردہ زرد چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

اس نے انوپما سے اپنے نئے کام کا ذکر کیا۔ لیکن اس نے پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ کتاب لکھ کر کوئی آدمی خوش حال نہیں بن سکتا۔ خوش حال ادیب اس دنیا میں کم ہی ہیں، اس میں انوپما کو ذرا بھی شبہہ نہیں تھا۔

انوپما کے پتا کا عظیم الشان محل نما مکان، خوب صورت موٹر، عیش وعشرت کے لوازمات، سب کچھ باکھر نے بہت غور سے دیکھا۔ سسر کسی مارواڑی تاجر کے ساتھ کلکتے میں کپڑے کی ایک عدد مل خریدنا چاہتے تھے۔ انوپما کی واپسی بہت آسان نہیں ہے۔ اگر وہ یہاں زیادہ دنوں تک رہا تو اپنی خود اعتمادی بھی کھودے گا۔ یہاں وہ دل کھول کر کسی سے اپنے من کی بات تو کہہ نہیں سکتا۔ سسر کی نصیحتیں دل سے تسلیم نہ کرنے کے باوجود ان پر 'نہیں' کیسے کہہ سکتا ہے۔

وہ لوٹ گیا۔ اس نے آتے وقت انوپما سے کہا ——

"کل میں چل رہا ہوں۔ تمہیں خیر جان جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تمہیں اچھا لگ رہا ہے/ رہ رہی ہو، جی میں جو اچھا سمجھو کرو۔ جس دن جی چاہے خبر بھیج دینا۔ میں آکر لے جاؤں گا اور بچی پر میرا حق ہے اس کے ساتھ ناانصافی نہ کرنا۔ سارا خرچ میں بھیجتا رہوں گا۔"

انوپما نے کہا تھا ——

"جس لڑکی کی شادی کر دی گئی، وہ تو ماں باپ کے یہاں رہتی ہے۔ آپ خرچ بھیج کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے گا۔"

وہ واپس آکر پھر ترجمے میں لگ گیا۔ شرلاک ہومز شایع ہوا۔ ناشر نے پانچ سو روپے بھیج دیے۔ اس نے انوپما کو لکھا۔ اپنے دشوار گزار راستہ

پر مجھے ایک سنگِ میل مل گیا ہے۔ میں اب پیچھے مڑ نہیں سکتا۔ محنت میرا مقصدِ حیات ہے۔ تم لوگوں کے لیے روپیہ بھیج کر شرمندہ کرنا میرا مقصد نہیں۔ محض یہ ثابت کرنا تھا کہ اپنی بیوی بچی کی پرورش کرنے کی سکت مجھ میں ہے۔

جواب آیا ——

"آپ میں سکت نہیں ہے۔ ایسا گمان بھی کبھی نہیں تھا۔ کتاب کا ترجمہ کر کے آسام یا ہندوستان میں بیوی بچوں کو کھلانا پہنانا ناممکن نہیں۔ اس بات سے آپ روگردانی نہیں کر سکتے۔ میں تو دن بہ دن مایوس ہوتی جا رہی ہوں۔ خیر جان پھر لوٹ سکوں گی یا نہیں۔ پتہ نہیں۔ شاید نہیں۔ آپ کی بیٹی نی نی پڑھ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ میں بے انصافی نہیں کروں گی۔"

بھیم سے ملنے آ کر ایک دن دریودھن نے باکھر سے کہا ——

"باکھر بابو، بڑی گندی بات ہوئی۔ گوری لائن سے چلی گئی۔"

باکھر ایک مشکل انگریزی جملے کا مناسب ترجمہ سوچ رہا تھا۔ دریودھن کی بات سن کر اسے حیرت ہوئی پھر بولا ——

"کیوں؟ گئی کہاں؟"

"او، اور نہ پوچھو۔" اس نے میز پر سے کتاب اٹھاتے ہوئے کہا ——

"ڈمڈما میں اس کا کوئی ماموں وغیرہ ہے، اسی کے یہاں رہ کر کام کرے گی۔ کلیاپانی کے اس جنگل کی طرف مکان ہے، ماں باپ نے بہت کہا لیکن اس نے سب ان سنی کر دی۔ کل ہی کام پر جاتے ہوئے کپڑے لتّے سب لیتی گئی۔"

باکھر نے کتاب کا غذ سمیٹ کر رکھ دیے۔ ایک سگریٹ جلا کر فونٹن پین بند کر دیا۔

گرین کلیاپانی میں ہی رہتا ہے۔

دریودھن نے پوچھا ——

"اچھا گرین بابو بھی تو وہیں رہتا ہے نا؟ کلیاپانی میں؟"

"ہاں!"

"یہ سب شاید فل بابو ہی کا کام ہے۔ چھی۔ بہت گندا آدمی ہے۔"

باکھر نے پوچھا ——

"کیا تجھے برا لگ رہا ہے"؟

"یہ سب بری بات ہے بابو۔ عزت و آبرو کا سوال ہے۔ ہم ماں بہنوں کے لیے لائن میں پہرہ دیتے ہیں اور یہ سب ایسا کر رہے ہیں"۔

دریودھن طیش میں تھا۔ وہ کتاب کھول کر نامانوس الفاظ کو یوں ہی دیکھتا رہا۔ اس کی زرد آنکھوں کے کونے گیلے ہو گئے۔ باکھر نے اس پر غور کیا۔

"کیا بھیم نے بتایا ہے"؟ باکھر نے پوچھا۔

"وہ بہت دکھی ہے۔ گوری کو وہ بہت زیادہ پیار کرتا تھا۔ اس سے کہنا مت اسے اور تکلیف ہوگی"۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ بھیم اندر آگیا۔ وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر میز کے پاس آیا۔ اور پرانی نبوں میں ایک اچھی سی نب تلاش کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ اس میں ایک دہشتناک جانور کی سی خونخواریت نظر آرہی تھی۔ باکھر اور دریودھن نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ دو نبیں لے کر وہ پھر باہر چلا گیا اور اپنے کمرے میں غائب ہوگیا۔

باکھر بولا اس نے باہر سے سب کچھ سن لیا ہے۔

دریودھن نے آہستگی سے کتاب میز پر رکھ کر باکھر کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں غم کے بادل لہرانے لگے۔ دوست کے تئیں ہمدردی کے تحت اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ دریودھن چلا گیا۔

باکھر نے تیز آواز میں کہا ——

"بھیم ایک کپ چائے دینے کے لیے کہنا"۔

رسوئیا کہیں نکل گیا تھا۔ بھیم نے آگ جلا کر ایک کپ چائے بنائی اور اسے لا کر دی۔ باکھر نے پوچھا ——

"کل کی باتیں لکھ چکا یا نہیں"؟

"لکھا ہے"۔ اس کی آواز گمبھیر تھی۔

"بھابھی کو خط لکھنے کو کہا تھا، لکھا"؟

"جی"!

"اور لڑائی کے بارے میں مضمون؟"

"لکھ ڈالا"

"دیکھوں۔ لے آؤ"

بھیم نے اپنے کمرے سے ایک کاپی لاکر سامنے رکھ دی جس میں جنگ کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا۔ باکھرنے پڑھا ــــــ

جنگ بری چیز ہے کیونکہ یہ آدمی کو برا بناتی ہے۔ جنگ انسان کا ذہن بگاڑ دیتی ہے۔ جنگ انسان کی دنیا اُجاڑ دیتی ہے۔ جنگ کے کام میں جو لوگ جاتے ہیں وہ لالچ میں پڑتے ہیں۔ تب وہ برباد ہو جاتے ہیں۔ انسان کا جانور بننے سے مرجانا بہتر ہے۔

باکھرنے کہا ــــــ

"اچھا ہے۔ تونے کم عرصے میں بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ کوشش کرتا جا۔ مشق ہی اصل چیز ہے۔ یہی زندگی ہے"

اس نے ہاتھ بڑھا کر کاپی لے لی۔ باکھر تقریر کرتا گیا۔ جنگ سے پہلے لوگوں کو پیسے کم ملتے تھے لیکن لوگ خوش تھے۔ کیوں کہ انہیں زیادہ کی خواہش نہیں تھی۔ آج کل روپے کافی ہیں۔ کافی ہونے پر بھی لوگوں کو تنگی ہے۔ مہینے میں بیس ملیں تو بھی تنگی اور ہزار ملیں تو بھی کم۔ روپے کی یہی تو خصوصیت ہے۔ مگر بیس روپے میں صرف ضرورت کی چیزیں خرید کر لوگ سکون سے رہ سکتے ہیں۔ ایک ہزار پانے پر عمدہ لوازمات چاہئیں۔ گاڑی چاہیے۔ نوکر چاہئیں، بنگلہ نما مکان اور بہت کچھ چاہیے۔ اسی لیے ہمارے ملک کے سادھو سنیاسی مٹی کی دنیا سے موہ نہ کرنے کے لیے کہا کرتے تھے۔ لیکن لوگوں نے ان کی تعلیم فراموش کر دی۔ اسی وجہ سے لوگوں کے من سے شانتی غائب ہو چکی ہے۔ ہم لوگ موہ میں پڑے بغیر رہ سکیں تو دنیا کے بہت سے دکھی لوگوں کے مقابلے میں ہم زیادہ آنند سے رہ سکیں گے۔

چپ چاپ تقریر سن کر بھیم باہر نکل گیا۔

باکھر نے دیکھا، کچھ اثر نہیں ہوا۔ بھیم ان باتوں سے متاثر نہیں ہوا۔ لکھنا

چھوڑ کر وہ گھومنے کے لیے باہر نکل گیا۔ اسے لگا۔ بھیم اپنے ارادے پر اٹل ہے۔ اسی وجہ سے اب تک اس میں اعتماد کرتا ہے۔ اسے پتہ تھا کہ دریودھن کافی دنوں سے فیلڈ میں کام کرنے کے لیے آمادہ کرتا آرہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔

کچھ دنوں بعد باکھرے نے دیکھا بھیم تقریباً آٹھ انچ لمبا ایک اوزار تیز کر رہا ہے۔ پتھر پر گھستے گھستے اوزار خوب چمک دار ہو گیا ہے۔ وہ سہم گیا۔ اوزار چائے کارخانے میں بنایا گیا ہے۔ وہاں کے کسی مستری نے موٹر کی اسپرنگ سے بنا دیا ہے۔

گرین آیا۔ اس نے شاکیہ سے روپے پیسے کے بارے میں بات چیت کی۔ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے بھیم نے گرین کو تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا۔ شاکیہ جب روپیہ رکھنے کے لیے اندر آ گئے تو وہ بھی اندر چلا گیا۔ باکھر گلا صاف کر کے خواہش نہ ہونے کے باوجود بھی گرین سے باتیں کرتے لگا۔ بھیم باہر نہیں آیا۔ شاید اندر ہی اوزار تیز کرتا رہا۔

جاتے وقت ڈرتے ڈرتے گرین مڑ کر دیکھتا گیا۔

نیا سبق بتانے کے بہانے بلا کر باکھر بھیم کے سامنے درس دیتا:

"آدمی میں تحمل چاہیئے۔ صبر چاہیئے۔ زمین پر بُرے لوگ ہی زیادہ ہیں۔ دوست کم اس لیے دشمن کا خاتمہ کرنے کے لیے جسمانی طاقت سے زیادہ غور و فکر تحمّل و بردباری ضروری ہے۔ ورنہ نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ بری دنیا کو اچھا بنانا ہوگا۔ اسے جلا کر خاک کر دینا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ آخر ہمیں یہیں رہنا ہے۔ اگر گندگی ہو تو اس کی صفائی کی جاتی ہے نہ کہ اسے آگ دکھا دی جائے۔"

شاکیہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ بھیم دن بہ دن جانے کیسا ہوتا جا رہا ہے، کام کاج کرتا ہے مگر ہنسی مذاق نہیں کرتا۔ ایک دن انہوں نے دریافت کیا۔

"بھیم! تجھے ہو کیا گیا ہے؟ یوں بجھا بجھا کیوں رہتا ہے؟"

بوڑھے کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے اس نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا۔

"کچھ بھی نہیں ہوا پتا جی۔ بجھا ہوا کہاں رہتا ہوں۔"

"اونہہ ۔ ۔ ۔" شاکیہ مطمئن نہیں ہو پائے۔ "دیکھ رہا ہوں، تو پہلے کی

طرح ہنسی مذاق نہیں کرتا۔ پھر کہتا ہے کہ بھا ہوا کہاں رہتا ہوں۔"

بھیم صفائی دیتا ہے ——

"کھانا وانا نہیں بنانا پڑتا ہے اسی لیے بالکل سست ہو گیا ہوں۔"

"یا فیلڈ میں کام کرنے کی تیری کبھی خواہش ہو رہی ہے ؟

"جی نہیں۔" وہ وہاں سے کھسک گیا۔

دوسرے دن بھیم کی کاپی دیکھتے وقت اس کی نظر پڑی پشت کے ایک صفحے پر لکھا تھا:

"پرم پوجیہ پتا نے کہا کہ کیا میں فیلڈ میں کام کروں گا ؟ اسی لیے میں آج رو رہا ہوں۔ اتنا دکھ مجھے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ فل نے میرا گھر اجاڑا۔ فل نے میرا دل توڑا۔ فل نے مجھے برباد کر دیا، پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ فل میں کام کرنے کی میری خواہش ہے ! بھگوان ! میری حفاظت کرو۔"

باکھر اب خاموش نہیں رہ سکا۔ وہ ایک دن شام کو گرین کے گھر کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ چھوٹے سے جنگل اور ایک بانس کی جھاڑی کے پاس تھا وہ چھوٹا سا گھر۔

اندر روشنی تھی۔ وہ بند دروازے کے قریب آیا۔ اندر دبی آواز میں بات چیت ہو رہی تھی۔ ایک مردانی اور ایک نسوانی آواز۔ ایک مرد اور ایک عورت !

اس نے دروازے پر دستک دے کر آواز دی ——

"گرین ، گرین ، دروازہ کھولو۔"

"کون ؟" گرین نے دروازہ کھول کر پوچھا۔

باکھر اندر آ گیا۔ فوری طور پر اسے بائیں کمرے کی طرف جاتی ہوئی ساڑی اور دو پیر نظر آ گئے۔

گرین حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے باکھر کی طرف دیکھا۔ اس کا جسم باکھر سے زیادہ تندرست اور طاقت ور تھا مگر باکھر کی

آنکھوں کی طرف دیکھنے میں وہ خود کو بہت کمزور محسوس کرتا۔ ان آنکھوں میں موت کا خوف نہیں ہے۔ وہاں صرف جرأت و ہمت ہے۔

باکھر نے دروازہ بند کر کے کہا ——

"مجھے شاید بیٹھنے کے لیے کہنے میں کہیں کوئی تامّل نہیں۔ تمہیں میں ...۔"

"بیٹھیے باکھر بھیّا!" مجرم کی طرح گرین نے ایک کرسی آگے بڑھا کر کہا ——
"مجھ سے غلطی ہوئی۔ بیٹھیے ......۔"

باکھر بیٹھ گیا۔ کرسی میز سے آراستہ کمرے میں صاف کپڑا بچھا ہوا بستر۔ میز پر ایک قیمتی ٹیبل لیمپ، ایک تپائی پر پھولوں سے بھرا گلدستہ۔

باکھر نے پوچھا ——

"اس کمرے سے باہر جانے کے لیے دروازے ہیں یا نہیں۔ مجھ سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھ سے کسی کا کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے۔ میں اچھے خیال کے تحت ہی یہاں آیا ہوں۔"

گرین نے دھیرے سے کہا —— "نہیں ہے۔"

باکھر نے پکارا —— "گوری۔ آ!"

کوئی جواب نہیں۔

"گوری، ادھر تو میرے سامنے آ۔ میں تجھ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تو یہاں رہتی ہے مجھے سب پتہ ہے۔ سبھی جانتے ہیں۔ میں تجھے مارنے پیٹنے کے لیے نہیں آیا۔"

گوری نکل آئی۔ اس کا چہرہ خوف سے سفید ہو گیا تھا۔ سلک کا بلاؤز اور قیمتی ساری اس نے پہن رکھی تھی۔ وہ سر اٹھا کر باکھر کی طرف دیکھ نہیں پاتی تھی ——

"گوری!" باکھر کی آواز میں پہلے سے زیادہ ملائمت تھی۔ میں تجھے طعنے دینے نہیں آیا ہوں۔ تو نے لائن چھوڑ کر اچھا کیا یا برا، یہ بات بھی کہنے نہیں آیا ہوں۔ تیری جو خوشی ہے وہی تو نے کیا۔ اس میں مجھے کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ میں آیا ہوں بھیم کے لیے۔"

گرین دوسرے کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ باکھر بولا ——

"تم یہیں رہ سکتے ہو گرین، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

گرین نے سر کھجا کر کہا ——

"نہیں بھیا۔ میں ذرا چائے کا انتظام کرنا چاہتا تھا"۔
"میں ابھی ابھی چلا جاؤں گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"۔
گرین نے سر جھکا لیا۔ باکھر نے سمجھا گرین سوچ رہا ہے کہ اس سے نفرت کی وجہ سے وہ اس کی لائی ہوئی چائے پینا نہیں چاہتا۔ اس نے کہا ــــــ
"ہو سکے تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی لاؤ"۔
گرین چلا گیا۔
باکھر بولا ــــــ
"گوری، بھیم سب سے اچھا آدمی ہے، ایسا میں نہیں کہتا۔ لیکن اس کے جیسا پیار و محبت کرنے والا انسان میں نے دوسرا نہیں دیکھا۔ وہ اتنا پیار کر سکتا ہے، میں اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تیرے چلے آنے کے بعد سے وہ بالکل بجھ گیا ہے۔ کام کرتا ہے لیکن بے دلی سے۔ ہنستا ہے تو بناوٹی ہنسی، لیکن رات کو بستر پر پڑا روتا رہتا ہے۔ میں اس سے پیار کرتا ہوں، اپنے بھائی جیسا پیار۔ اس کا دکھ دیکھ کر اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا"۔
گوری خاموش تھی۔ بازار میں پردے کے سامنے کھڑی تصویر کی عورت کی طرح!
باکھر کہتا گیا ــــــ
"بھیم جیسا پیار میں تیری بھابی سے کر پاتا ہوں یا نہیں، کہہ نہیں سکتا۔ میں اسی وجہ سے تیرے پاس آیا ہوں"۔
گرین نے پانی کا گلاس لا کر باکھر کے ہاتھوں میں دے دیا۔ پانی پی کر اس نے کہا ــــــ
"گوری تو چل، لوٹ چل۔ بھیم کے پاس چل۔ اسے بچا لے۔ نہیں تو وہ پاگل ہو جائے گا"۔
گوری چپ رہی۔
باکھر نے پھر پکارا ــــــ
"گوری!"۔
پھر بھی وہ چپ رہی۔
باکھر اٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گوری کے ہاتھوں کو پکڑ کر کہا ــــــ

"گوری !"

گوری ' بابو' کہہ کر اس کے پیروں پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ باکھر کا ایک پیر پکڑے رہی۔ کچھ بھی نہیں بولی۔ گرین ایک کرسی پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کیے رہا۔

اس سین کا راز اس کے ذہن سے پرے تھا۔

گوری کے سر کو ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے باکھر بولا ــــــ

"گوری، جیسے بھیم میرا بھائی ہے ویسے ہی تو بھی میری بہن ہے۔ تو شاید سوچ رہی ہے کہ میں تجھے دیکھنا نہیں چاہتا۔ بہن پر کبھی غصّہ آنے کے بعد کیا بہن بھائی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔؟"

گوری کے اندر ایک ہلچل مچ گئی۔ اسے لگا جیسے وہ پاپ کی کیچڑ میں لت پت ہو گئی ہے۔ اس کا سارا جسم ایک دم گندا ہو گیا ہے۔ خشک ساحل پر کھڑے دیوتا کی طرح باکھر بابو اسے دلدل سے نکالنا چاہتے ہیں۔ کچھ ہی فاصلے پر ترحم آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا کھڑا ہے۔ بھیم ! وہ بھی دیوتا جیسا آدمی ہے۔

باکھر بولا ــــــ

"گوری، تو میرا دکھ سمجھ نہیں پائے گی۔ میں رویا ہوں، کتنا رویا ہوں، تو نے نہیں دیکھا، تو، تو بس یہ ذرا سا رو رہی ہے۔ میں کتنے کتنے دن تک روتا رہا ہوں۔ اور بھیم تو مجھ سے بہت زیادہ رویا ہے۔"

گوری نے اس کے پیروں کو زور سے پکڑتے ہوئے کہا ــــــ

"میں جاؤں گی بابو !"

باکھر نے اسے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا اور نہ رونے کے لیے اسے تسلّی دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر گوری بھی ماموں کے گھر کی طرف چل پڑی۔ گرین چہرہ چھپا کر کافی دیر تک بیٹھا رہا۔

دوسرے دن اسکول جاتے وقت باکھر نے بھیم کو یہ خوش خبری سنائی۔ بھیم اوزار تیز کر رہا تھا۔ باکھر نے پہلے دوسری باتیں چھیڑیں اور اصل بات بعد میں بتائی۔

بھیم کھڑے ہوکر اوزار کے دستے پر ہاتھ جما کر بولا ــــــ
"مجھے بازاری عورت نہیں چاہیے۔"
باکھر اندر جاکر بیٹھ گیا۔ بازاری، یعنی فاحشہ!
حالانکہ گوری کے واپس آنے کی ابھی کوئی خبر نہیں ملی۔ وہ شاید لمحے بھر کے لیے اپنی غلطی تسلیم کرسکتی تھی۔ لیکن سویرا ہوتے ہی رات کی ساری باتیں بھول گئی۔ شاید گرین نے اسے پھر سے بہکا لیا ہے۔
باکھر کو تھکاوٹ سی محسوس ہوئی۔ بھیم کو اپنے حال پر چھوڑ کر کتاب کا غذ سنبھال وہ اسکول میں ہی ترجمہ کرنے لگا۔ اسکول کی چھٹی ہونے کے بعد دکان میں چائے پی کر شام تک اسکول میں ہی لکھتا رہتا۔ گھوم پھر کر رات کو ہی واپس آتا۔ رات کو پھر لکھتا۔ ناشر نے تقاضہ کیا ہے۔ ترجمے کی اجازت مل چکی ہے۔ جلدی ترجمہ کرکے پریس کے حوالے کرنا ہے۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت پر باکھر کو سات سو روپے ملیں گے۔
انوپما کا خطاب رسمی بن کر محض چار پانچ سطروں تک محدود ہو گیا ہے۔
"اچھی ہوں ــــ نی نی گھٹنوں کے بل چل رہی ہے ــــ وہ خیر جان نہیں جائے گی۔"
انوپما کتنی بدل گئی ہے ــــ؟ یہ بات سوچ کر صرف دل دکھتا ہے۔ دکھ ہونے پر وہ آگے کام نہیں کرسکتا۔ اسی وجہ سے وہ نہ سوچنے کی کوشش کرتا۔ بس دن رات لکھنے میں لگا رہتا۔ رینو کبھی کبھی کہتی دیدی نے بلایا ہے۔ وہ جواب دیتا مجھے فرصت نہیں۔
ایک دن گری اسکول میں ہی آ پہنچی۔ چھٹی ہو چکی تھی۔ اس نے چوکیدار کو چائے لانے کے لیے بھیج کر کتاب کا غذ کھول لیا۔
"باکھر دا" وہ آفس کے اندر ہی آ گئی۔
اسے ناگوار سا لگا۔ اسی لیے کچھ بھی کہے بغیر اس نے گری کی طرف دیکھا۔ ایک کرسی پر وہ بیٹھ گئی۔
"کیا ہے گری؟" اس نے معمول پر آنے کی کوشش کی۔
"بھلا آپ کتنے مصروف ہیں، یہی دیکھنے آ گئی۔" باکھر ذہن کو معمول

پرلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ انجانے میں ہی بے حد سنجیدہ ہو گیا ــــــ "مجھے کتنے سبق سمجھنے ہیں۔ بھلا آپ آئے کیوں نہیں، باکھروا۔۔؟"

باکھر نے نہایت تحمل سے کہا ــــــ

"میں ایک کتاب کا ترجمہ کر رہا ہوں گری، مجھے بالکل فرصت نہیں ملتی ہے۔"

"اوہ! آپ یہ سب کرنے لگے ہیں۔ وہ کتاب دیکھی تھی۔ پڑھی نہیں۔ کیوں یہ سب کر رہے ہیں۔؟"

"روپے کے لیے۔!"

"ایک میں کتنے روپے ملتے ہیں بھلا۔؟"

"کوئی ٹھیک نہیں۔ ناشر طے کرتا ہے۔ چار سو، پانچ سو، چھ سو۔"

"تو آپ مجھے پڑھانے نہیں آئیں گے؟"

"دیکھ تو رہی ہو کہ میں مصروف ہوں۔"

"ہمارے یہاں بھی تو آپ لکھ سکتے ہیں۔ اس گندے سے آفس میں بیٹھ کر آپ کو کیا اچھا لگتا ہے۔؟"

"اپنے اس ٹوٹے ہوئے گھر یا اس گندے آفس کے بغیر تو میں کچھ لکھ ہی نہیں سکتا گری۔"

چوکیدار نے ایک گلاس چائے اور دو ٹکڑے برفی کے لاکر میز پر رکھ دیے۔ گری نے کسی طرح سے ناک سکوڑے بغیر پھر سے کہا ــــــ

"شام کو تو آپ ہمارے یہاں سے ہی چائے پی کر آ سکتے ہیں۔"

"یہ گڑ کی چائے پیئے بغیر میرے جذبات ہی بیدار نہیں ہوتے۔" کہہ کر اس نے چائے کا گلاس اٹھا لیا۔

گری نے کچھ دیر بعد کہا ــــــ

"آپ کو اچانک ہی روپیوں کی اتنی ضرورت کیوں پڑ گئی باکھروا؟"

"سن کر کیا کرو گی گری؟ ہمیشہ پتا جی کی کمائی کھاتے رہنے سے تو ہی کام نہیں چل سکتا ہے نا! میں شادی شدہ ہوں۔ ایک بچی کا باپ ہوں۔ انہیں پالنا پوسنا ہے۔ میں تعلیم یافتہ نوجوان ہوں۔ اپنی صلاحیت کا ثبوت بھی تو دینا ہوگا نا۔؟"

"آپ کو مجھے پڑھانے کے لیے آنا ہی ہوگا باکھرڈا۔ نہ ہو تو ایک کتاب
کی قیمت میں ہی دے دوں گی۔"

"صرف ایک کتاب کی قیمت ؟ دو روپے یا ڈھائی روپے ہوں گے ۔
بھلا اس سے کیا ہونے والا ہے ۔؟"

" نہیں ، نہیں ۔ایک کتاب لکھنے پر جو معاوضہ ملتا ہے وہ ۔"

" رام ، رام ، رام ۔گری ، چھی تمہارے پتاجی نے اس دن کہی تھی ——
کرانی کو رشوت دے کر زیادہ روپے کا جھوٹا بل پاس کرانے کی بات ؟ یاد
ہے یا نہیں ؟ ہے کیا ؟ پتاجی کا وہ کیا تھا۔ لالچ نہیں ہے کیا"؟ باکھر گری کو بتاتے
ہوئے پر مذاق لہجے میں کہتا گیا —— "کتابوں میں پڑھا ہے ، لوبھ ہی پاپ ہے،
پاپ ہی موت ، مجھے بھلا پاپ کے پیسے کے لینے کے لیے کیا تمہیں کہنا چاہیے ؟
تم میری شاگرد ہو، میں تمہارا گرو ٹھہرا۔ ایشور کے سمان ! بھلا تمہیں ایسی
پاپ کی بات گرو کے سامنے کہنی چاہیئے کیا ۔؟"

گری شرم سے سرخ ہوگئی ۔کسی طرح سے کہا ——

" اوں ، جاییے ، آپ بڑے ویسے ہیں ۔ میں یہ سب بھابی کو لکھ بھیجونگی.
تب دیکھیے وہ کیسا مزا چکھائیں گی ۔"

باکھر نے دیکھا ، گری جینت کے لائے ہوئے ولایتی کپڑے کا بلاؤز اور
بلیک مارکیٹ سے خریدے ہوئے دس روپے گزوالے ولایتی وائل کی چادر
پہنے ہوتے ہے ۔اس کی کمی کو اس سے الگ کرنے کی ذمہ داری ان کپڑوں پر
بھی ہے ۔ وہ کچھ نہیں بولا ۔ چوکیدار کی دوکان میں گلاس دے کر سگریٹ لانے
کے لیے پیسے دیے ۔

گری بولی ——

"تو پھر میں میٹرک کا امتحان نہیں دے سکوں گی نا باکھر دا ۔؟"

باکھر کو غصہ آرہا تھا ۔اس کی زبان سے انوپما کا ذکر سن کر وہ اپنے اوپر
قابو نہیں رکھ سکا تھا ۔ اس نے پوچھا ——

" بھلا تمہیں میٹرک کا امتحان دینے کا اتنا شوق کیوں ہوا ہے گری ؟
کیا میٹرک پاس نہ کرنے پر جینت نے تم سے شادی نہ کرنے کو کہا ہے کیا ؟"

"جائیے - آپ کو پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے"۔ وہ بھنبھناتی ہوئی گھر چلی گئی۔

باکھر سے اب لکھا نہ گیا۔ کاغذات سمیٹ کر وہ آفس سے نکلا۔ چوکیدار بھی یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ بہت دیر تک رکنا پڑے گا لیکن اسے جاتا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

ایک رات باورچی بھاگ گیا۔

دریودھن نے کئی روز بعد آکر بتایا کہ اس نے باورچی کو فیلڈ میں کام کرتے دیکھا ہے۔

بھیم نے پھر کھانا بنانا شروع کر دیا۔ لیکن اس کی غلطیوں کے باعث شاکیہ اور باکھر پریشان ہو اٹھے۔ کبھی ترکاری میں نمک زیادہ ہو جاتا تو کبھی بالکل ہی نہیں پڑتا۔ شاکیہ کو صبح اٹھنے پر معمول کے مطابق چائے نہیں ملتی۔ کبھی کبھی تو بھیم گھر سے مسلسل غایب ہو جاتا اور کبھی رات کو لائن میں نکل جاتا۔ سویرے کافی دیر تک واپس نہیں آتا۔ باکھر کافی رات گئے سوتا۔ صبح اٹھنے کی خواہش نہ ہونے کے باوجود بھی اٹھ کر چائے بنانی پڑتی۔

اسی وجہ سے وہ انوپما کو لانے گیا تھا۔ 'بی بی' 'ماں' پکارنے لگی تھی۔ رونے کو بطور ہتھیار استعمال کرنا جان گئی تھی۔ کچھ ہی منٹوں میں اس نے پتا کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ کھڑی ہو سکتی تھی۔ پیروں پر چلنے میں دیر نہیں تھی۔

انوپما کی صحت کافی اچھی ہو گئی تھی۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتی اور سیر سپاٹا۔ سہیلیوں کے ساتھ کیرم کھیلتی، آنکھوں میں بھولا بسرا ماضی پھر سے لوٹ آیا تھا۔ انوپما نے اسے بھی گھومنے کے لیے چلنے کو کہا تھا لیکن اس کے انکار پر وہ بی بی کو لے کر موٹر پر چڑھ کر چلی گئی تھی۔

"کئی ۔!" باکھر نے کہا تھا ــــ "تو تم نہیں جاؤ گی ؟"

"ابھی میری خواہش نہیں۔ اس کے علاوہ جی بھی اچھا نہیں"۔

"ٹھیک ہے، رہو، ابھی جانے کی ضرورت نہیں"۔

"کیا آپ مجھے لینے کے لیے ہی آئے تھے۔؟"

"ہاں، ہمیں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ باورچی بھاگ گیا ہے۔ بھیم کو جانے کیا ہو گیا۔ کھانے پینے کی بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ پتا جی کو کبھی کبھی بغیر چائے پیئے دفتر جانا پڑتا ہے۔"

انوپما ایک دم بدلے ہوئے لہجے میں بولی ——

"اوہ! تب تو آپ مجھے باورچی کے بدلے میں ہی لینے آئے ہیں؟"

تبھی گھر کا باورچی باکھر کو چائے دے گیا۔ باکھر سر سے پیر تک جھنجھنا اٹھا۔

"لکی، تمہاری بات یکسر غلط نہیں ہے لیکن یہ خیال لے کر میں یہاں نہیں آیا تھا۔ میں غریب آدمی ہوں، یہ بات تمہیں شادی سے قبل معلوم تھی۔ حالانکہ ہماری شادی والدین نے ہی کروائی تھی پھر بھی ہمیں ایک دوسرے کو جاننے کا موقع ملا تھا۔ اب جیون کا دکھ سکھ یکساں طور پر ہمیں آپس میں تقسیم کرنا ہوگا۔ میں تو یہی سوچ کر آیا تھا۔"

انوپما کچھ نہ کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

رات کو کھانے کے بعد اس نے کہا ——

"آپ کا بستر لگا دیا گیا ہے جی۔"

بستر پر جاکر باکھر چپ چاپ لیٹ گیا۔ اس نرم و گداز توشک میں جیسے کانٹے ہی کانٹے ہوں۔ نی نی کو پاس بلا کر اس کے پورے جسم کو چوم ڈالا۔ نی نی کی نئی نئی سیکھی ہوئی 'بابا، بابا' بولی نے اس کے دل کو جھنجھوڑ ڈالا۔ دیر تک کھیلتے ہوئے وہ اسی کی گود میں سو گئی۔ اسے ٹھیک سے سلا کر وہ بھی لیٹ گیا۔ نی نی کے نرم و ملائم جسم کو سینے سے لگا کر وہ جیسے سب کچھ بھول سا گیا۔

انوپما اسے ایک گلاس پانی دینے آئی۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھا۔ انوپما نی نی کو لے جانا چاہتی تھی۔ باکھر نے اسے روک کر کہا ——

"رہنے دو لکی، یہ آج میرے ہی ساتھ سوئے گی۔"

"رات کو مجھے تلاش کر کے روئے گی۔"

"میں بہلانے کی کوشش کروں گا۔"

"میں پاس نہ رہوں تو یہ کسی سے نہیں بہلتی۔"

"بھلا دیکھوں، میں بھی آج کوشش کروں۔ نہیں تو تمہیں بلا لوں گا۔" وہ انوپما کو اپنی طرف کھینچ لینا چاہتا تھا۔ اس نے کسی جذبے سے عاری لہجے میں 'ہٹیے' کہہ کر باکھر کی بانہوں کو ہٹا دیا۔ رات کو لیٹے لیٹے باکھر سوچتا رہا۔ چڑھی ہوئی ندی کے بندھ میں اگر کہیں دراڑ پڑ جائے تو وہ بتدریج چوڑی ہی ہوتی جاتی ہے اور پانی بھی مسلسل اسی طرف سے بہتا رہتا ہے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر کر بڑی ہو گئیں۔

وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔

منگرا اور بکل آتے رہتے۔ انہیں ہر مہینے فیلڈ میں کام چاہیے تھا۔ گوری کے لیے بکل کو کوئی فکر نہیں تھی۔ اس نے شاکیہ سے کہا تھا، ٹھیک ہے بابو! وہ ماموں کے یہاں رہ کر روپے کما رہی ہے، ٹھیک ہی ہے۔ یہاں سے آنا جانا مشکل ہے۔ کبھی کبھی تو لاریاں آتی ہی نہیں۔ میں بھی درمیان میں اس کے یہاں جاتا رہتا ہوں۔ وہ سارا پیسہ مجھے سونپ دیتی ہے۔

شاکیہ پندرہ دن کی چھٹی لے کر گاؤں چلے گئے۔ وہ سرکاری سڑک کے کنارے زمین لے کر مکان بنوانا چاہتے تھے۔ ان کا ایک دوست تھا۔ گاؤں کا موضع دار، لکڑی چروانے اور ٹھیکیدار کا انتظام کرنے کے سلسلے میں انکی خط و کتابت ہوتی رہی تھی۔ ان پندرہ دنوں میں وہ کام شروع کروا دینا چاہتے تھے اور کام پورا کرے گا موضع دار۔ ساری ذمہ داری لینے کو وہ تیار تھا۔

باکھر 'ازی ٹوکل' کو ختم کرنے میں منہمک تھا۔

ڈیوڈ آیا۔ پتہ چلا کہ تبادلہ ہو کر وہ گیا جانے والا تھا۔ باکھر کی ذہنی الجھن کا اسے علم تھا۔ اس نے انوپما کی بابت دریافت کیا۔

باکھر بولا ——

"وہ اپنے پتا کے پاس ہے ڈیوی۔ طبیعت اچھی نہیں، اسی وجہ سے میں نے اسے آنے سے منع کیا ہے۔ یہاں آ کر بے کار تکلیف ہی ہوگی۔"

"بچی کیسی ہے؟"

"نی نی؟ وہ پڑھ رہی ہے ڈیوی۔ وہ بڑی خوب صورت ہے۔ بولنا سیکھ

رہی ہے "۔

"نی نی کی تصویر ہے کیا باکھر؟"

"نہیں ہے"۔

"تم مجھ سے وعدہ کرو کہ گیا کے پتے پر اس کی ایک تصویر مجھے بھیج دوگے۔ میں شاید چند دنوں میں ہی امریکہ چلا جاؤں گا۔ مسز شاکیہ سے جاتے وقت مل بھی نہیں سکا"۔

ڈیوڈ گیا جانے والا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر باکھر کو اطمینان کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے اندر کی تپش ڈیوڈ نے نہیں دیکھی تھی۔ لیکن اس کا بے لوث پیار اس نے سمیٹ کر دل میں رکھ لیا تھا۔

آخر میں رخصت ہوتے وقت ڈیوڈ نے اپنا شبہہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"باکھر، جانے سے قبل میں اپنے ذہن کا ایک شک مٹا کر جانا چاہتا ہوں۔ میں تم سے کھل کر ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں"۔

باکھر نے اس کی طرف دیکھا۔

"باکھر، ہندوستان میں میں نے تمہیں کو اپنے سب سے نزدیکی دوست کی شکل میں پایا ہے۔ تمہارے کچھ نہ کہنے کے باوجود یہ بات میں تمہاری آنکھوں میں پڑھ سکتا ہوں۔ مگر صرف آنکھوں میں کیوں، میں نے تمہارے ہر عمل سے یہ محسوس کیا کہ تمہارے دل میں کوئی ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔ تم بہت اچھے انسان ہونے کے باعث ہی میرے سامنے اس کا اظہار پسند نہیں کرتے"۔

باکھر سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔

ڈیوڈ بولا ——

"اس بار بھی جب کٹی یہاں تھی، میں نے یہ ذکر چھیڑا تھا۔ تب تم جنگ کا تذکرہ نکال کر میرے اور میرے جیسے بہت سے بد قسمت لوگوں کے دکھ پر دکھی ہوتے تھے۔ ان دنوں اور آج کی باتوں کے درمیان کیا کچھ مشترک ہے؟"۔

کچھ دیر خاموش رہ کر باکھر بولا ——

"ڈیوی، تم سپاہی ہو، تمہارے سامنے جنگ کے خلاف کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ تم میرے لیے ایک سپاہی سے کہیں بلند ہو،

تم انسان ہو، میرے دوست ہو۔ تم یہ نہ سوچنا کہ میں جنگ کو برا سمجھتا ہوں بلکہ میں جنگ کو ایک غیر ضروری عمل ضرور سمجھتا ہوں۔ تمہارے صدر ابراہم لنکن نے ملک کی سالمیت اور عوام کی آزادی نیز سرکشوں کا سر کچلنے کے لیے سرکاری فوج بھیجی تھی، یہاں تک تو جنگ لنکن کے لیے ضروری تھی۔ لیکن جنگ میں قربانی دینے والے ہر امریکی سپاہی کے غم میں رات کو آنسو بہایا کرتے تھے، یہیں آکر جنگ ان کے لیے ایک المیہ بن جاتی ہے۔"

ڈیوڈ ایک ٹک باکھر کی طرف دیکھتا رہا۔

باکھر کہتا گیا ——

"ڈیوی، جرمنی اور جاپان کو میں بھی مجرم گردانتا ہوں۔ میں بھی چاہتا رہا کہ ان کی طاقت چور ہو جائے، مگر میری آنکھوں کے سامنے ہی کتنے لوگوں کی دنیا اجڑ گئی —— اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر میں صرف رویا کرتا ہوں۔ تم نے بھی ضرور ان سب باتوں پر غور کیا ہوگا۔ تم شاید کہو گے کہ میں بزدل ہوں۔ مگر کیا کرو گے، دنیا میں کمزور بھی تو ہوتے ہیں نا۔!"

ڈیوڈ بولا ——

"ابراہیم لنکن کمزور نہیں تھے باکھر۔!"

"میں تو صدر نہیں ڈیوی۔ بس ایک معمولی ٹیچر ہوں۔"

"لنکن کے اندر کا صدر جنگ نہیں کرتا تھا۔ جنگ کرتا تھا اور رات کو روتا تھا اس کے اندر کا انسان ہی۔ تمہاری بات میں رد نہیں کرتا باکھر۔ تم جو سوچتے ہو وہ سب کے لیے سچ ہے۔ ماں اور ایما جب بھی خط لکھتی ہیں، ہمیشہ میرے لیے دعائیں کرتی رہتی ہیں۔ ان کے دل میں کون سا خوف ہے، کون سا احساس ہے، میں جانتا ہوں۔ لیکن تم تو ایک منطقی انسان کی طرح محض دیکھ کر تجربات حاصل کرتے رہے ہو۔"

ڈیوڈ کی معصومیت پر باکھر کو ہنسی آگئی۔ ڈیوڈ چلا گیا۔

ایک دن دریودھن نے بتایا ——

"باکھر بابو! گوری ایک دم ڈوب گئی۔ وہ اتنی پاپی ہے۔ اس کا مجھے اندازہ

ہی نہ تھا۔ وہ آج کل ملٹری کی گاڑی پر چڑھ کر گھومتی رہتی ہے۔"
باکھر اسے گالیاں دینے لگا۔
"تم سب مجھے پاگل بنا دوگے۔ گوری کی بات مجھ سے کیوں ؟ فیلڈ میں کام کرنے بھیجا تھا تو یہ بات یاد نہیں آئی تھی جو اب مجھے بتانے آئے ہو ؟ مرے گوری، اس سے میرا کیا ہوتا ہے ؟"
دریودھن سر جھکائے لائن میں چلا گیا۔ اچانک غصّہ آجانے کے باعث باکھر کے مزاج میں تلخی پیدا ہوگئی تھی۔ انوپما آئی نہیں۔ اپنے دو خطوں کے جواب میں اسے ایک خط ملتا تھا۔ اس میں بھی جان نہیں رہتی۔ گرین آیا کرتا، پتاجی کو روپے دے جاتا۔ پھرے جاتا، پھر لوٹا دیتا۔ کسی طرح سے ترجمہ کر کے اس نے مسودہ ناشر کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ ناشر نے افسوس کرتے ہوئے کہا تھا ــــــ
"باکھر شاید تمہیں وعدے کے مطابق سات سو روپے نہیں دے سکوں گا پانچ سو ہی دے سکوں گا۔ کیوں کہ شرلاک ہومز میں ہمیں کچھ نقصان ہوا ہے۔"
اس نے ناشر کی طرف دیکھا! ناشر نے سر جھکا لیا۔ وہ لوٹ آیا۔ سمجھ گیا کہ ناشر بھی خالص کاروباری ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔ وہ نڈھال ہو کر گھر میں پڑا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی ساری طاقت ختم ہوگئی ہے۔ وہ اب کبھی نہیں لکھ سکے گا۔ بچوں کے ادب سے متعلق اس نے کچھ سچے واقعات جمع کر کے رکھے تھے۔ عالمی لغت، بک آف نالج وغیرہ کو سنبھال کر رکھا تھا۔ لیکن اب اس جانب اس کی طبیعت ہی مائل نہیں ہوتی تھی۔
بک آف نالج کھول کر اس نے پڑھنے کی کوشش کی لیکن پڑھ نہیں سکا۔ کتاب پھینک کر دل ہی دل میں کہہ اٹھا ــــــ "کِٹی! تم سنگدل ہو! پتھر ہو!

اسی درمیان ایک دن شام کو جیون دادا آنکلے۔ ہفتہ بھر سے بڑھی ہوئی داڑھی کو لالٹین کی روشنی میں بنانے بیٹھ گئے۔ گندے کپڑے لتے بھی رات کو خود ہی دھوئے۔ وہ دوسرے دن رہ کر رات کو روانہ ہو جانے والے تھے۔ کپڑے دھوتے دھوتے جیون دادا نے پوچھا ــــــ

"شاکیہ، میں تو کپڑے کبھی دھو نہیں سکتا۔ دیکھتا ہوں، صابن دھلتا ہی نہیں۔ بھلا کیا کیا جائے"؟

باکھر ہنس کر بولا ——

"دھوتے رہیے۔ خود آپ کا لگایا ہوا صابن ہے نا، دھل جائے گا۔"

جیون دادا نے کہا ——

"ہوں، تب تو اپنے کیے ہوئے پاپوں کو بھی دھو سکوں گا شاید"!

"بھلا کون سے پاپ کیے ہیں آپ نے۔؟"

"زندگی تو کچھ پاپوں کا ہی مجموعہ ہے شاکیہ۔ نہیں تو کیا میری ایسی حالت ہوتی؟ یا آپ کی ہی ایسی حالت ہو پاتی؟"

"پاپ کیا ہے؟ ایسا تو کچھ مجھے یاد نہیں آتا۔"

"آپ کے پتاجی ہیں یا نہیں؟"

"کہیے۔ وہ سن نہیں پائیں گے۔"

"وہ پاپ کر رہے ہیں نا؟ اور ان کے پتا نے کر رکھے ہیں۔ اور ان کے بھی پتا نے کیے ہوں گے۔ ان کا پھل آپ کو بھگتنا ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو ہمارے ساتھ ناانصافی ہے۔"

"اگر ناانصافی ہو تو بھی کوئی چارہ نہیں۔ پھر ناانصافی بھی کہیں کیسے؟ ہمارے پتاجی نے کتنے ہی من افیون بیچی تھی۔ ہم نے اس سے اپنا جسم بنایا۔ اس سے عقل حاصل کی۔ انجانے میں ہی کیوں نہ ہو، پاپ تو کیا ہے۔ اسی لیے پرائشچت کے بغیر چارہ نہیں ہے۔"

باکھر نے کچھ جواب نہیں دیا۔

کھانا کھا کر دونوں پورٹیکو میں بیٹھ کر پھر باتیں کرنے لگے۔ انوپما کی بات چلی، ڈیوڈ سے جیسا کہہ دیا تھا، باکھر نے ویسی ہی بات جیون دادا سے بھی کہنے کی کوشش کی مگر جیون دادا کو جنگ کا تجربہ ڈیوڈ کے مقابلے بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے کرید کرید کر بات نکال لی۔ باکھر نے آخر تک ساری باتیں تسلیم کر لیں۔

"شاکیہ"۔ جیون دادا نے کہا —— "ایک پرانی مثال یاد آ رہی ہے۔ یہ

دنیا سچ مچ ایک تھیئٹر ہے - کچھ لوگ اداکاری کرتے ہیں - کچھ لوگ دیکھتے ہیں -
اداکار بھی لطف لیتے ہیں اور تماشائی بھی - ان دونوں کے رشتے سے ہی
تھیئٹر کی تکمیل ہوتی ہے - لیکن تماشائی بھی دو طرح کے ہوتے ہیں - ایک تو وہ
جو اداکاروں کے ساتھ رو کر، ہنس کر، پاگل بن کر لطف حاصل کرتے ہیں اور
دوسری طرح کے لوگ کرداروں کی اداکاری کا محاسبہ کرتے ہیں، بحث کرتے
ہیں، ایسا ہونا مناسب ہے، ایسا ہونا نامناسب ہے، ان کی تعداد کم ہے -
انہیں 'ناقد' کہتے ہیں - انہیں کچھ لطف بھلے ہی مل جائے لیکن سیری نہیں
ہوتی ؟"

باکھر خاموش رہا -

جیون دادا کہتے گئے ــــ

"آپ 'ناقد' ہیں - آپ اداکاری نہیں کرتے، محاسبہ کرتے ہیں - اچھے
برے کے بارے میں سوچنا آپ کا کام ہے - آپ اداکاری کی خامیوں کو دور
کرنے کے لیے تنقید کرتے ہیں لیکن آپ کی سیری کبھی نہیں ہوسکتی - کیتکی تماشائی
ہے، صرف تماشائی - اداکار کے ساتھ - وہ ہنس کر وہ سیر ہوجاتی ہے - اداکارہ
کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی 'رومانس' نامی بے معنی شئے کو حقیقت میں تلاش
کرتی ہے - آپ کشتی کی رفتار متعین کرنے میں منہمک رہتے ہیں لیکن وہ ساحل پر کوئی
خوب صورت سا منظر دیکھتی ہے تو اتر جانا چاہتی ہے - اور آپ کو نہ اداکار کا تفاخر مل
پاتا ہے اور نہ ہی تماشائی کا لطف - آپ کے حصے میں تو بس ناقد کی بے اطمینانی
آتی ہے -

دوسرے دن سویرے جیون دادا چلے گئے -

باکھر سوچتا رہا، سچ مچ ہی تو وہ زندگی میں سکون حاصل نہیں کرسکا - وہ کبھی
مطمئن نہیں ہوسکتا - گرین تو خوش ہے کہ وہ اداکاری میں ڈوب گیا ہے - جیون
دادا کو مسرت ہے کہ انہوں نے تماش بینوں کے لیے کوئی بڑا کام کیا ہے -
انو پما کو خوشی ہے کہ وہ تو اچھا برا، مناسب، غیر مناسب' پر غور کرتے ہوئے
سب کچھ کھو بیٹھا ہے - سنہرے دھان کے کھیتوں کے خالق گرین کو اس نے
بھگا دیا ہے - اس کے جسم میں زندگی کی رو دوڑانے والی کیتکی اس کی تنقید نہ

برداشت کر کے الگ ہو گئی ہے۔ کمزور پتا اب معمولی سے اداکار کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ کچھ وقت اداکاری کرتے ہیں اور زیادہ تر تماشائی بنے رہتے ہیں۔ جیون دادا بھی اس کی زندگی میں آ نہیں سکتے۔

جیون دادا نے باکھر کے نام ایک طویل خط لکھا۔ شاکیہ سمدھی کے یہاں گئے ہوئے تھے۔ بہت دن بعد جیون دادا بھی گھر پہنچے تھے۔ شاکیہ کے ہاتھ انھوں نے خط بھیجا تھا۔ خلاصہ تھا —— ایک دن دو گھنٹے وہ انوپما سے بحث کرتے رہے مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ انوپما صرف تماشائی ہے۔ موقع ملنے پر وہ اداکاری کے میدان میں اترنا ہی چاہتی ہے۔ جیون دادا سے اس نے خوب بحث کی۔ جیون دادا کو خواہش ہوئی کہ اس کے گولی مار دیں۔ انقلابی آدمی کا خون بہت جلد گرم ہو جاتا ہے۔

ہوا بھرا ہوا بلیڈر بڑا نازک ہوتا ہے شاکیہ۔ اس میں زندگی کا احساس ہوتا ہے، مگر کسی طرح سے پھوٹ گیا تو پھر خیر نہیں۔ ساری ہوا پھڑا پھڑا کر نکل جاتی ہے۔

لگتا ہے کہ انوپما کو میں بھی پہچان نہیں پا رہا ہوں۔ کالج کے ایک نوجوان دوست کے ساتھ اکثر گھومنے جایا کرتی ہے۔ گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔ پتا جی کاروبار کر رہے ہیں —— اسی کا حصے دار خاص مشیر اور ہاتھ بٹانے والا ہے وہ نوجوان۔ وہ اس کے پتا سے بہت قریب ہے۔ موٹر چلا سکتا ہے۔ ادھی بھی پہننا جانتا ہے، کھادی بھی۔ اس کے اپنے نام سے ایک چائے بگان ہے۔

میں جانتا ہوں کہ شاکیہ آپ کو یہ سب جان کر دکھ ہوگا، مگر دکھ کو ہی اپنا ساتھی نہ بنا لیں۔ دکھ کے پارس پر اپنے کو گھس کر سونا بنا لیں۔ آپ 'ناقد' ہیں۔ ہماری خامیوں کو دور کریں۔

باکھر گاؤں گیا۔ جو نیا مکان بن رہا ہے، پتا جی کے کہنے کے مطابق اسے جا کر دیکھ آیا۔ مکان کا کام موضع دار ٹھیک طرح سے کر رہا ہے۔ کچھ وقت

میں مکان پورا ہونے والا ہے۔

اسی کھلے گاؤں میں اس کا من کھلا کھلا سا لگا۔ یہاں جنگ کی ہلچل نہیں تھی۔ ٹرک یا ہوائی جہاز نکلنے پر بھی ان کے معمول میں کوئی فرق نہ آتا اور وہ کھیتی باڑی میں لگے رہتے۔ گاؤں کے وہ ایک نوجوان سپاہی کی نوکری میں لگے ضرور ہیں مگر شام کو ڈھینکی کی آواز گھر سے سنائی دیتی ہے۔ موضع دار کا مکان حویلی جیسا تھا۔ گرین کا نیا مکان بنا ہے۔ باکھر کا مکان بھی دیکھنے کے لائق تھا۔ پھر بھی لوگ نام دھر کی ویدی کے سامنے گایا کرتے ــــــ

رام نام نہ لیلوں ، ہرت نہ بھجلوں
کہ کام کری لوں ، آمی ہے رام رام
(رام نام نہیں لیا ، ہری کا بھجن نہیں کیا
کیا کام کیا ہم نے ، او رام رام)

جیون دادا کی ہمت افزائی کے باعث ہی آگے قدم بڑھانے کی صلاحیت اس میں پیدا ہوتی ہے۔ اب بھی کچھ لوگ اس رو میں بہے بغیر ثابت قدم ہیں۔ اب بھی 'آزار' کے پیڑوں میں نئی کونپلیں نکلنے پر بہت سے دیوانوں کا دل امنڈ آتا ہے۔ اب بھی چھاتی بھر دھان کے پودوں کے بیچ کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے ہو کر رندے وغیرہ ان نچلے کھیتوں میں جہاں پانی کچھ خشک ہو گیا ہے، ردبنی کرنے جایا کرتی ہیں۔

جانے دو، جو جا رہے ہیں انہیں چلے جانے دو۔ ساتھ دینے والے کافی لوگ اب بھی ہیں۔ نظام بھی ہے۔ بھیم کو بھی ساتھ دے سکے گا اور دنیا میں کتنے سارے گاؤں ہیں۔

وہ بچوں کا ادب لکھنے میں جٹ گیا۔ لکھنے میں اسے مہارت حاصل ہو گئی ہے۔ خیلات کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں اسے کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔ جیون دادا کو وہ دور ہی سے پرنام بھیجتا۔ یہ دریافت جیون دادا ہی نے تو کی ہے کہ وہ ناقد تماشبین ہے۔ اداکاری کرنے کی ہمت اس میں نہیں ہے ــــ دوسروں کو منع کرنے کا حق بھی وہ نہیں رکھتا۔ وہ اپاہج ہے۔ وہ کچھ کر نہیں سکتا۔ برا بھی نہیں۔ بھلا بھی نہیں۔ وہ صرف افسوس کرنا چاہتا ہے خطرناک

ڈاکو بن کر بھی شہرت حاصل کی جاسکتی ہے اور سیاست کے ذریعے ملک کی خدمت کر کے بھی۔ تو پھر وہ تنقید ہی کرے گا۔ ناقد کا کام کرے گا۔ وہ لکھے گا۔ وہ انسانی ذہن کی تعمیر کرے گا۔ وہ خامیوں کو دور کرے گا۔ وہ مکمل انسان بنے گا۔

ایک سی۔آئی۔ڈی۔ انسپکٹر آیا۔ جیون بروا کا پتہ لگانے۔

باکھرنے کہلا بھیجا ـــــ

"نہیں آئے۔"

ایک کے بعد ایک، تین ایسے لگاتار واقعات ہوئے جنہوں نے باکھر کی خاموش زندگی میں ہلچل پیدا کر دی۔

پڑھتے پڑھتے اور لکھتے لکھتے تھک جانے کے بعد سورج ڈوبنے کے وقت وہ اکثر نالے کے پاس کھڑا ہو جاتا تھا۔ نالے کے کنارے تک بانس کی ٹٹیاں لگا کر باغیچہ لگایا تھا۔ ٹٹیوں پر ہاتھ رکھے وہ میلوں پھیلے نالے کی وسعتوں کو دیکھتا رہتا۔ دور کی ڈھلان کے سرسبز میدان کی ہر بالی پر پھیلی ہوئی شام کے سائے دیکھ کر اس کا ذہن پرسکون ہو جاتا۔ تنہا تنہا کھڑے ہوئے پیڑ جانے اسے کس بات کی یاد دلا دیتے۔ وہ اپنے آپ کو کافی حد تک بھولا رہ سکتا تھا۔ من میں شانتی بھلے ہی نہ ملے، کم از کم فکروں سے تو آزاد ہو جاتا تھا۔

لیکن جلد ہی سکون درہم برہم ہو گیا۔

ایک دن سویرے گوری کی لاش کلیا پانی ندی کے کنارے بانسوں کے جھرمٹ میں ملی۔ لاش کس نے پہلے دیکھی تھی؟ اس کا علم کسی کو نہیں لیکن پل بھر میں لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ بکل اور اس کی پتنی آکر دھاڑیں مارنے لگے۔ مامی، ماں بھی آنسو بہانے لگیں۔ پولیس آئی، گرین سہم گیا۔ اسے یقین ہی نہیں ہوا کہ گوری جو پہلی رات کو ہی اس کے یہاں سے نکل کر گئی تھی، وہ زندہ عورت اس طرح ویران ندی کے کنارے بانسوں کے جھرمٹ میں اس شکل میں مری ہوئی ملے گی۔

دو ایک سپاہیوں نے بھی یہ منظر دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ گوری کروٹ لیے ہوئے پڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں خوف کا بسیرا، چھاتی کے کپڑے اور

بلاؤز کھلے ہوئے ۔ ایک پستان اور ایک گال پر دانتوں کے نشان اور کسی طرح کی چوٹ کی کوئی علامت نہیں تھی ۔ دونوں ہونٹ کاٹے پڑ گئے تھے ۔

اس کا خوب صورت جسم ایک بے جان کاٹھ کے ٹکڑے کی طرح پڑا ہوا تھا ۔

وہاں کھڑے ہوئے لوگوں نے سپاہیوں کی جانب حقارت کی نظروں سے دیکھا ۔ سپاہی وہاں سے ہٹ گئے ۔ انہیں معلوم تھا کہ انہیں میں سے کسی نے یہ کام کیا ہے ۔ اگرچہ انہوں نے خود یہ کام نہیں کیا تھا لیکن برادری کے بھائیوں کے جرم کی کالک ان کے جسم پر بھی لگے بغیر نہیں رہ سکتی ۔

سچ مچ ڈنڈما کے علاقے میں خوف کا سایہ منڈلانے لگا ۔ اس سے قبل ایسا کوئی گھناؤنا واقعہ ہوا ہو ، لوگوں کو یاد نہیں آتا ۔

سپاہی گھر باہر ظلم کرنے لگے ہیں ۔ یہ تو نئی بات نہیں ۔ ہر طرف خوف و ہراس تھا لیکن گوری کی موت تو غیر معمولی واقعہ ہے ۔ سپاہیوں میں جانور بھی ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ جانور بھی اتنی بہیمیت کا ثبوت دے سکتے ہیں ۔ نظام نے باکھر سے کہا ۔۔۔۔۔

"باکھر ایسے کتنے ہی ہراس پھیلانے والے واقعات ابھی رونما ہونے والے ہیں ، جن کا تصور بھی ہم نے نہیں کیا ہے ۔"

منگرا اور بکل شاکیہ باکھر کے پاس آئے ۔ دریودھن بھی ساتھ تھا ۔ بکل دیر تک روتا رہا ۔ کسی کے سمجھانے بجھانے پر بھی اسے سکون نہیں ملتا ۔ تجربہ کار شاکیہ نے کہا ۔۔۔۔۔

"بکل ، بھلا رونے سے کیا ہونے والا ہے ؟ یہ جنگ ہمارے لیے صرف دکھ ہی لائی ہے ۔ سبھی طرف سے رونا پڑے گا ۔ بھلا کتنا روئے گا ۔ کتنا افسوس کرے گا ؟"

باکھر نے متعجب ہو کر بپتا کی طرف دیکھا ۔

"بھلا کتنا روئے گا ؟ کتنا دکھ کرے گا ؟"

جاتے وقت سسک سسک کر بکل کہتا گیا ۔۔۔۔۔

"میں بدلہ لوں گا ۔ ضرور لوں گا ۔ میں خون خرابہ کر دوں گا ۔ رات کو لائن پر پہرہ

دوں گا۔سپاہی آئیں۔میں خون پی جاؤں گا ــــــ بے ایمان ـــ جانور"!

بھیم میز پر سر ٹکائے سسک سسک اور درمیان میں پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔پاس کھڑے ہو کر شاکیہ، باکھر اور دریودھن اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے رہے۔دریودھن دوست کو پکڑے رہا۔

"بھیم" ! شاکیہ بولے ـــــ "آخر کرے گا کیا؟ آدمی کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہوتا ہی ہے۔قسمت میں اگر بُرا ہے تو برا ہو گا ہی۔اس لیے رونے سے کچھ حاصل نہیں، خود دھرم کے مطابق رہنا چاہیئے۔دوسرے کی بھلائی کرنا دھرم کا کام ہے۔وہ کام کرنے کے لیے ہمیں کافی قوت چاہیے۔روتے رہیں تو ہم کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔"

شاکیہ کے چلے جانے پر باکھر نے کہا ــــــ

"بھیم! پتاجی کی باتوں پر ذرا دھیان دے۔اپنے اندر ہمت پیدا کر۔آج کل دنیا میں زندہ رہنے کے لیے کافی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔میرا دکھ کیا تو نے نہیں دیکھا؟ اگر میں اپنے اندر ہمت پیدا نہیں کرتا تو شاید مر ہی گیا ہوتا۔"

بھیم دریودھن کے ساتھ شمشان گیا۔گوری کی لاش کو دفنانے میں دوسروں کے ساتھ اس نے بھی مدد کی۔خاموش اور سنجیدہ ہو کر سر جھکائے رہا۔اس کی ساس اسے بانہوں میں بھر کر سر گال ہاتھوں سے سہلاتی ہوئی رو رو کر بولی۔

"بیٹا! تو ہی میرا اصلی بیٹا ہے۔میری بیٹی بدمعاش تھی۔تجھے پہچان نہیں سکی۔وہ سالی، جانے دے، اب وہ مر کر بھوت ہو گئی۔"

تین چار دن بعد بھیم معمول پر آگیا۔وہ پہلے کی طرح باکھر وغیرہ کے کام کاج کرنے لگا حالانکہ پہلے جیسی رسیلی بولی نہیں بولتا تھا۔بات بھی بہت کم ہی کرتا۔

اس کی فکر کا چشمہ ہمیشہ کے لیے خشک ہو گیا تھا۔لیکن اس کے سکھ کا چشمہ بھی تو وہی تھا۔اس لیے وہ پورے طور پر پہلے والا آدمی نہیں بن سکا۔لیکن اتنے پر ہی باکھر اور شاکیہ خوش تھے۔وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ انہیں چائے اور میٹھی بھر بھات وقت پر مل جاتا بلکہ وہ بھیم کو گھر کا ہی ایک فرد سمجھتے تھے۔

باکھر اس لیے خوش تھا کہ اسے زندگی کے سفر میں ایک اور ساتھی مل گیا۔

اس کے بعد دوسرا واقعہ۔

ایک دن دریودھن باکھر کے پاس آکر بہت دکھی من۔سے بیٹھ گیا۔کہنے لگا۔

"اب فیلڈ میں کام کرنے نہیں جائے گا۔مرنے پر بھی۔"

"کیوں"؟ باکھر نے اس انداز سے پوچھا جیسے اسے تعجب ہوا ہو ——— "بھلا فیلڈ نے تیرا کیا بگاڑا ہے یودھن؟"

"مت پوچھیے بابو" بجھے ہوئے لہجے میں اس نے کہا ——— "آپ نے ٹھیک کہا تھا، یہ گورے بہت برے ہیں۔ایک دم بے ایمان ہیں۔ان فیلڈوں میں کام کرنا مہا پاپ ہے۔"

باکھر بولا ———

"کہہ تو بھلا، صاف صاف بتا آخر کیا ہوا؟"

تب دریودھن نے بات کھول کر بتادی۔اسے آج بلا وجہ ایک امریکن سارجنٹ نے تھپڑ مارا اور زمین پر گرا کر لات گھونسے لگائے۔دن جان فیلڈ سے کوارٹر ماسٹر گودام میں دریودھن وغیرہ کافی لوگ سامان لا رہے تھے۔چیزوں کو لاتے وقت ایک ساتھ بندھا ہوا سلک کی جرابوں کا ایک بنڈل جانے کہاں گم ہوگیا کہ تلاش کرانے پر بھی نہیں ملا۔سارجنٹ کو غصّہ آگیا ——— کیونکہ وہ جرابیں خود چوری چھپے اڑائے جانے کے خیال سے اس نے دریودھن کو الگ رکھنے کے لیے کہا تھا۔کچھ دیر بعد دوپہر کے کھانے کے لیے ایک ملازم ناشتے کے پیکٹ تقسیم کر رہا تھا۔وہ مزدور کچھ بھوک کے مارے اور کچھ مذاقاً ان پیکٹوں کو لینے کے لیے دھکم دھکا اور کھینچا تانی کر رہے تھے۔آخری پیکٹ جیسے ہی دریودھن ایک آدمی سے چھین کر لے جا رہا تھا تبھی وہ سارجنٹ آپہونچا۔اسے بھی پیکٹ چاہیے تھا۔کام کرنے والی کچھ مزدوروں نے اس سے مانگے تھے۔لیکن پیکٹوں کی خالی پیٹی اور دریودھن کو پیکٹ لے جاتے دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہوگیا۔نہ کوئی بات، نہ چیت، دریودھن کے بال پکڑ کر دونوں گالوں پر دو تھپڑ لگائے اور زمین پر گرا کر تابڑ توڑ گھونسے مارنے لگا۔

گوروں سے دریودھن ڈرنا ضرور تھا لیکن اسے مار کھانی پڑے گی ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ خیر جان بگان کے صاحب بہت سے مزدوروں کو مارا کرتے تھے۔ مزدوران سے بھوت کی طرح ڈرتے تھے۔ لیکن موٹے مسٹنڈے دریودھن کو صاحبوں کے ہاتھ سے مار کھانے کی امید نہ تھی۔ صاحب بھی اس کے کام میں نقص نہیں نکال پاتے تھے۔ وہ بڑا ہی سیدھا سادہ آدمی ٹھہرا

مگر اب سارجنٹ اسے تھپڑوں سے مار رہا تھا۔ دریودھن اسے روک نہیں سکا۔ اتنے سارے گورے سپاہی جانے کیا کر ڈالیں، کیا پتہ ؟ وہ ٹھہرے راجہ کی ذات والے، ان کے جسم پر ہاتھ پڑے تو کیا پتہ پولیس کے حوالے کر دیں۔

باکھر نے ہنس کر کہا ـــــ

"اسی وجہ سے کیا تو فیلڈ میں کام کرنا چھوڑ دے گا۔؟ صاحب بہادر نے مارا ہے، مارنے دے، کسی بُرے آدمی نے تو نہیں مارا ہے نا۔؟"

دریودھن نے متعجب ہو کر پوچھا ـــــ

"مگر بابو تو نے تو کہا تھا نا، امریکن لوگ ہمارے ہی جیسے آدمی ہیں ! یہ سب بھلا ہمیں کیوں ماریں گے ؟"

پاس کھڑا بھیم مسکرا رہا تھا۔ اس نے کہا ـــــ

"تو پھر تو نے الٹ کر مار کیوں نہیں لگائی ؟"

پشیمان ہو کر دریودھن نے کہا ـــــ

"ارے اتنے سارے گورے فیلڈ میں ہیں اور میں ہوں تنہا، تب تو وہ مجھے مار ہی ڈالتے" کچھ تامل کے بعد۔ وہ جیسے اپنے آپ سے ہی کہتا گیا ـــ 'باکھر بابو نے کہا تھا، ولایت امریکہ میں جو گورے لوگ رہتے ہیں سب ہمارے جیسے ہی لوگ ہیں۔ ان ملکوں میں ہمارے جیسے ہی قلی ہیں۔ جھوٹ موٹ! وہ اور ہم برابر نہیں ہیں، وہ گورے ہیں ہم کالے ہیں۔ فلم میں دیکھا ہے، نیگرو لوگوں سے امریکن نفرت کرتے ہیں۔ چائے بگان کے بابوؤں سے بھی صاحب لوگ کچھ نفرت کرتے ہی ہیں۔'

باکھر کو افسوس ہوا۔ اس نے دریودھن کی جانب بہت محبت سے دیکھا۔ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا پر اپنے ذاتی احساسات کے سہارے اس نے ایک بڑی سچائی تک رسائی حاصل کر لی ہے، وہ گورے ہیں ہم کالے۔

وہ دونوں کو پاس بٹھا کر کالے لوگوں کی کہانیاں سنانے لگا۔ ابراہم لنکن، ٹام کا کا کی کٹیا، کو۔ کلیکس کلین، دکھنی افریقہ گاندھی، ایک کے بعد ایک کی کہانی وہ بڑی بے صبری سے سنتے گئے۔ باکھر نے انہیں اپنے گھر کے پاس کی پرانی بات یاد دلادی ——— چائے بگانوں کا کوئی مزدور آکر کہیں بھاگ جاتا تو اسے چوکیداروں سے پکڑوا کر چوکیداروں کے ذریعے ہی اس کے دونوں ہاتھ دونوں طرف سے پکڑے رکھ کر بہادر بڑے صاحب 'رائی دان' بید سے اسے تب تک پیٹا کرتے جب تک کہ وہ بے ہوش نہیں ہو جاتا تھا۔

شدید کرب کے احساس سے باکھر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے چہرے کی جانب دریودھن ایک ٹک دیکھتا رہا۔ دیوتا، ہاں' باکھر بابو دیوتا جیسے ہی ہیں۔

" جان چلی جائے تو بھی اب میں فیلڈ میں کام نہیں کروں گا" ——— کہہ کر دوسری بار قسم کھا کر دریودھن بھرے ہوئے دل سے لائن میں چلا گیا۔

اور تیسرا واقعہ!

باکھر نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ایسا غیر معمولی واقعہ رونما ہو گا۔ غیر انسانی افعال کو دیکھ دیکھ کر دھیرے دھیرے لوگوں کی حیرت بھی اب کم ہوتی جا رہی تھی۔ بہت سے لوگوں کی زبان سے خاص انداز میں بیان کردہ یہ کہانی باکھر نے سنی۔

باکھر کا وہ پرانا شاگرد بودھن خیر جان بگان میں نمبری بدمعاش تھا۔ سپاہیوں کی کالی کرتوتوں میں ان کی ہر طرح مدد کر کے روپیہ حاصل کر رہا تھا۔ ان کرتوتوں میں مزدوری کرنے والی جوان لڑکیوں کو روپے کا لالچ دے کر سپاہیوں سے ملا دینا ہی خاص کام تھا۔

ایک رات کی بات ہے پوس کے کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ پونم

کی روپہلی چاندنی چھٹکے رہنے کے باوجود دبیز کہرے کے باعث ذرا سے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی۔

لائن سے بھیم اور دریودھن چپ چاپ نکل کر چائے کے پودوں کے درمیان سے جہاں چائے کی پتیاں وزن کی جاتی تھیں ویسے ایک گھر کی جانب چل پڑے۔ ان کے ہاتھوں میں کارخانے کے بنے ہوئے چھرے تھے۔ اس گھر سے کچھ دوری پر چائے کے پودوں کے درمیان وہ گھات لگاکر چھپ گئے۔ دو امریکن سپاہی! بڑی سڑک پر جیپ روک کر اس وزن گھر کی جانب دونوں نے قدم بڑھائے۔ ان کے جسم پر گرم سوٹ، گرم قمیص اور لمبا کوٹ تھا۔ لمبے کوٹ کی جیب میں رم کی بوتلیں، سر پر سن ہیلمٹ ٹوپ۔ وہ سگریٹ نکال کر پی رہے تھے اور درمیان میں جیب سے بوتل نکال کر منہ سے لگا لیتے تھے۔ وہ انتظار کر رہے تھے۔ دور کہرے کی چادر میں لپٹی لائن کی طرف دیکھتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ (بات چیت کچھ اس طرح ہو رہی تھی۔)

"جانی، بودھن نہیں آئے گا شاید!"

"آئے گا جینی، آئے گا۔ بودھن بہت سیدھا لڑکا ہے۔"

لائن سے چور کی طرح نکل آیا بودھن۔ لمبی پینٹ، بوٹ جوتا اور خاکی ٹوپی میں ملبوس، ساتھ دو لڑکیاں۔ اس نے دونوں کو سمجھا دیا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

حالانکہ وہ دونوں لڑکیاں ڈرتی نہیں تھیں۔ ایک تو ایک دم تلوار لیے گھوڑے پر سوار بہادر عورت کی طرح کہہ اٹھی — نیگرو سپاہی سے بھی نہیں ڈرتی، پھر یہ امریکن سپاہی کون سی چیز ہیں؟

بھیم اور دریودھن بے تاب ہو گئے۔ چھروں کے دستوں پر ان کی گرفت سخت ہو گئی۔ اگلے لمحے کے بارے میں سوچ کر وہ بے قابو سے ہو گئے۔ بودھن کے باہر جانے کے بعد دونوں نے نکل کر ان کا پیچھا کیا۔ دروازے پر کے سخت دشمن بھیم اور دریودھن جیسے ازل سے ہی دوست بن کر اپنے مشترکہ دشمن کے خاتمے کے معرکے میں نکل آئے ہیں۔

بودھن اور لڑکیوں کو دیکھ کر دونوں سپاہی نہایت خوشی سے آگے

بڑھے ۔ شریف لڑکے بودھن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہوں نے ایک ایک لڑکی کو بانہوں میں بھر لیا۔ بودھن بہت ہی خوش تھا۔

بودھن کو پہرے پر رکھ کر لڑکیوں کو لیے دونوں سپاہی وزن گھر میں گھس گئے۔ کھلا گھر تھا۔ پردے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

پاپ ! خدا کی سرزمین پر انسان کا پاپ ۔ تین تین پاپ ، ایک ہی جگہ پر ایک ہی وقت میں ، ایک ہی ساتھ ۔ بودھن کا پاپ ۔ دونوں سپاہیوں اور دونوں لڑکیوں کا پاپ ۔ پاپ کرنا بہت آسان ہے ۔

دریودھن کے چھرے کی ضرب سر پر پڑتے ہی بودھن چیخ پڑا —— ماں رے ، مار ڈالا رے ، فوراً ہی سینے پر بھیم کے چھرے کی ضرب پڑتے ہی بودھن کی آواز بند ہو گئی ۔ وہ وہیں زمین پر گر پڑا۔

بھیم اور دریودھن بے تاب جانوروں کی طرح دوڑ کر وزن گھر میں گھس گئے۔ بھاگ کر آتے ہوئے ایک سپاہی سے ٹھوکر کھا کر بھیم گر پڑا۔ وہ سپاہی وہاں سے تیزی کے ساتھ نکل گیا۔ اسے سنائی پڑا ، اس کا ساتھی وزن گھر کے اندھیرے میں چیخ رہا ہے ——

"جونی ، جونی ۔ می کلڈ ! جوسس کرائسٹ ! اکرائسٹ !!!"

اس کے بعد مکمل خاموشی ۔

دونوں لڑکیاں وزن گھر سے نکل کر لائن کی طرف دوڑ پڑیں ۔ ان کے قدم بے ترتیب پڑ رہے تھے۔

خون آلود چھرا ہاتھ میں لے کر دریودھن نکل آیا۔ بھیم کے ساتھ ساتھ اس نے بھی دور جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی ۔ دونوں پڑے ہوئے بودھن کے پاس آئے ۔

بودھن مر چکا تھا ! اس کے جسم کے پاس خون کا تھکّا ! وہ پھر وزن گھر میں گئے ۔ سپاہی بھی مر چکا تھا۔ اس کے جسم کے پاس بھی خون کے تھکّے تھے ۔

دونوں باہر آکر سوچ بچار کرنے لگے ۔ اب کیا کیا جائے ؟ سوچنے کے ساتھ ان کے سارے حواس لوٹ آئے ۔ دونوں کو خوف محسوس ہوا ۔ اب کیا

ہوگا ؟ وہ کہاں بھاگ کر بچ سکیں گے ؟

کافی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد ان دونوں نے طے کیا کہ دونوں لاشوں کو لے جاکر ندی میں بہا دیں۔ جہاں جانا ہو جائیں۔

ان لاشوں کو بیدوں میں باندھ کر ان دونوں نے لے جاکر چشمے میں بہا دیا۔ وہ ان کی سورگ یاترا ہے یا نرک یاترا، اس پر غور کرنے کے لیے رکے بغیر وہ دونوں خون آلود چہرے دھو کر تیزی سے لائن کی طرف چل پڑے۔

اس کے بعد وہ خیر جان میں نہیں تھے۔ رات کو ہی جانے کہاں نکل گئے کوئی نہیں بتا سکتا۔ کسی سے کچھ بھی کہہ کر نہیں گئے۔ گھر سے کوئی چیز بھی نہیں لیکر گئے تھے۔ سویرے دکھائی پڑا وزن گھر کے باہر جما ہوا خون کا تھکّا۔

ایک دن شام کو جانے کہاں سے جیون دادا آکر انوپما کے کمرے میں داخل ہوئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا ــــــ

"ککّی، جاکر ایک کپ چائے لا۔ بہت تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے ۔ کافی دور سے آیا ہوں۔ سیدھے پاسی گھاٹ سے ۔

انوپما کو خاموش دیکھ کر جیون دادا کو تعجب ہوا۔ اپنی تھکاوٹ بھول کر وہ اسے غور سے دیکھنے لگے۔

انوپما کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ نہ جانے کس دکھ سے اس کی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں۔ جسم بے جان نظر آرہا تھا۔ ایک بار جیون دادا کی طرف دیکھ کر وہ اٹھ پڑی اور "میں کہہ آتی ہوں" کہہ کر دروازے کی طرف مڑی۔

جیون دادا نے اسے روک کر پوچھا ــــــ

"تمہیں کیا ہو گیا ہے ککّی"؟

"کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ انوپما اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی وہ پھر آکر بیٹھ گئے۔ اچانک وہ فکر مند ہو گئے۔ اٹھتی، بیٹھتی، ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی نی نی ان کے پاس آئی۔ کاجل لگی چمکیلی آنکھوں سے دروازے کے قریب کھڑی ہو کر جیون دادا کی طرف دیکھتی رہی۔

"نی نی!" وہ لپک کر پاس پہنچے۔ اسے اٹھا کر چومتے ہوئے وہ پھر کرسی

پر بیٹھ گئے۔

نی نی! ماما! ماما!

جلد ہی نی نی ماما کو پہچان کر گھل مل گئی۔ لمحے بھر کے لیے انوپما ان کے ذہن سے نکل گئی۔ انوپما ایک کپ چائے لے کر آئی۔ چائے پیتے پیتے جیون دادا بولے ——

"کنکی، میں آتے وقت ڈنڈما سے ہو کر آیا ہوں۔ شاکیہ کے یہاں بھی گھنٹہ بھر رہا۔ وہاں ایک بہت دردناک حادثہ ہوا ہے۔ گوری یا کیا نام تھا ان کے نوکر کی پتنی کا وہ مر گئی۔ آزادانہ طور پر ملٹری کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ ایک رات ملٹری والوں نے اسے مار ڈالا۔ تم لوگوں کے اس کیمپ چندسے دریودھن یا کسی اور کے ساتھ مل کر ایک امریکن اور ایک مزدور لڑکے کو کاٹ ڈالا، اب وہ دونوں فرار ہیں۔ اب تک پکڑے نہیں جا سکے۔"

وہ چونک کر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ جیون دادا نے دیکھا، وہ بڑی بے صبری سے اس کی باتیں سن رہی ہے۔ بات ختم ہونے پر اس نے بے تابی سے پوچھا ——

"اور دوسرے لوگ تو اچھے ہیں نا، بھیا؟"

"اچھے ہی تو دیکھا تھا۔ مگر کنکی تیرا من تو مرجھایا مرجھایا سا دیکھ رہا ہوں۔۔؟"

انوپما نے کچھ نہیں کہا۔ جیون دادا نے اُسے ٹٹولنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ صرف انکار کرتی گئی۔ جیون دادا کے اندر چھپا ہوا انقلابی کچھ کام نہیں کر سکا۔ عورت کی غم ناک تصویر کے سامنے انقلابی بھی پگھل کر نرم ہو گیا۔

انہوں نے گھر کے دوسرے لوگوں سے وجہ جاننے کی کوشش کی۔ کسی تجارت کی بات پر ان دنوں باپ بیٹی میں زوروں کی بحث چل رہی ہے۔ ایک چینی بڑھئی اور ایک چینی افسر کے ذریعے وہ کسی چیز کی برآمد کا کاروبار کر رہے تھے۔ اسی بات پر انوپما ناراض ہے۔ کیوں کہ وہ چیز غیر قانونی ہے۔

جیون دادا نے اندازہ لگا کر کہا ــــ
"افیون !"
اس کے علاوہ اس کے پتا شراب بھی زیادہ پینے لگے ہیں، پہلے بھی ڈاکٹر کی صلاح کے مطابق وہ تھوڑی مقدار میں پیتے تھے۔ لیکن اب تو مسلسل اور زیادہ مقدار میں پینے لگے ہیں۔
تیسری بات ــــ انوپما کو پتہ چلا کہ اس کا نوجوان دوست بھی بڑا شرابی ہے۔ دونوں چینیوں کے ساتھ کاروبار میں وہ پیش پیش ہے۔ اور شاید اس نے انوپما سے بہت ہی غیر ذمہ دارانہ اور غلیظ بات کہہ دی ہے۔
اس کے بعد جیون دادا بڑے بھائی کے پاس گئے۔ وہ ایک بڑا سا سگار ہونٹوں سے لگائے انگریزی اخبار پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے جیون سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ان کی آنکھیں لال تھیں ــــ
"تو پھر کرانتی کاری!" انہوں نے ہنس کر پوچھا ــــ "سماچار کیا ہے؟ بتاؤ تو۔"
رسمی سوالوں کے جواب دے کر جیون دادا اصل بات کی طرف آئے۔ انہوں نے زور زور سے ہنس کر کہا ــــ
"او، کٹی کی بات؟ بالکل بے کار لڑکی ہے۔ باکھر کو دیکھ کر پریم میں پڑی۔ اصل میں وہ پریم تھا ہی نہیں۔ نشہ ٹوٹا، اب گھر میں پڑی سڑ رہی ہے۔ باکھر بھی بے معنی چیز ہے۔ میں نے کہا ــــ کٹی! پھر سے شادی کر لے۔ اس کے دوست نے بھی پیش کش کی تھی شادی کرنے کی۔ لیکن کٹی ناراض ہے۔"
کچھ تامل کے بعد جیون دادا نے کہا ــــ
"سنا ہے کچھ کاروبار وغیرہ کی بات پر جھگڑا ہوا ہے۔"
"ان سب باتوں میں پڑنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ ہم مرد چاہے باہر جو کچھ بھی کاروبار کریں، بھلا اسے یہ سوچ کر فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"
"مشکل ہے۔ آپ تو شاید افیون بیچتے ہیں نا؟" بڑے بھائی نے تیز نظروں سے جیون دادا کی طرف دیکھا۔ لیکن ظاہرا ہنستے ہوئے کہا ــــ
"اچھا، سمجھ لو کہ افیون ہی بیچی ہے یا کپڑے کی مِل کھولی ہے۔ مگر اسے ٹانگ

اڑانے کی کیا ضرورت ہے ؟"
جیون دادا جانے کے لیے کھڑے ہو گئے ۔ بڑے بھائی نے پوچھا ــــ
"کیوں ، کچھ کہتے نہیں ، کیوں ؟"
" میری جیب میں ایک ریوالور ہے ۔ مگر فائر کرنے پر آواز ہو گی ۔ اسی وجہ سے چپ ہوں ۔"
بڑے بھائی سہم گئے ۔ لیکن ذہن کے خوف کو چھپاتے ہوئے کہا ــــ
" اتنا آسان نہیں ہے ینگ مین ! ہماری طاقت بہت بڑی ہے جانتے ہو ؟ میں یہاں ہوں ، کلکتے میں ایک ہے ، بمبئی میں دو ۔ سرحد پر فوج اور سپاہیوں کے ساتھ خود سپہ سالار نر کانت بردا ہیں ۔ شاید اسے پہچانتے ہو گے ۔ نر کانت جیسا ہوشیار آدمی نہیں مل سکتا ۔ آل کوائٹ آن دی ایسٹرن فرنٹ ۔"
جیون دادا پھر انوپما کے پاس آئے ۔ اپنی حاصل کردہ معلومات سے اسے آگاہ کر کے ہر طرح تسلی دی ۔
انوپما نے کہا ــــ
" بھیّا ! میں بہت بے اطمینانی سے دن کاٹ رہی ہوں ۔ جسے دوست سمجھ کر اعتماد کیا تھا وہ اس طرح کی بیہودہ پیشکش کرے گا ، کبھی سوچا بھی نہیں تھا ۔ پتاجی بھی اتنی نچلی سطح پر آ جائیں گے ۔ یہ بھی وہم و گمان میں نہ تھا ۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنی ازدواجی زندگی میں کبھی خوش نہیں رہ سکی ۔ لیکن سکھ نام کی چیز کی تلاش میں خود کو کر دنے جا رہی ہوں ؟ اس کا بھی مجھے علم نہیں ہے ۔ میں آج خود کو بہت بے سہارا پا رہی ہوں ۔ لگتا ہے کہ جو کچھ کر رہی ہوں سب کچھ غلط ہے ۔ پتہ نہیں کیوں اس دنیا میں مجھے کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا ۔ میں باؤلی ہو گئی ہوں ۔ اس دن سے بی بی کو سینے سے لگائے صرف روتی رہتی ہوں ۔ پتاجی شراب پی کر غیر انسانی کام کر رہے ہیں ۔ کتنے لوگوں کی نظروں سے گر چکے ہیں ۔ پولیس کے ہاتھوں پکڑے جائیں تو پتہ نہیں کیا ہو گا ۔ سوچ رہی ہوں ، ایسے نرک میں کیسے رہوں ؟"
جیون دادا خاموش رہے ۔

اس وقت ماں ہانپتی ہوئی تیزی سے اندر آئی۔ اس نے کہا ـــــ
"جیون، تھانے کا داروغہ آیا ہے، ہمارا نیا ریڈیو دیکھنا چاہتا ہے۔ شاید اندر آنے کا بہانہ ہے۔"

انوپما فوراً جیون دادا کو پچھلے دروازے سے باڑی کے کونے تک تاریکی سے گزرتے ہوئے لے آئی۔ باڑی کے کونے سے باہر نکل جانے کی ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی۔ کچھ ہی سیکنڈ کے اندر دونوں سڑک پر آ گئے۔

جیون دادا نے سوچا تھا کہ شاید انوپما پھر خیر جان جانے کی خواہش کر سکتی ہے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ پھر سے باکھر کے پاس لوٹ جائے باکھر جیسا قیمتی 'باکھر' (ہیرا) نہ پہچان کر کچی نے غلطی کی ہے۔

اسی وجہ سے ذہنی جھٹکا لگانے کے لیے جاتے جاتے جیون دادا نے کہا ـــــ

"کچی شاید میں ایک دو دن میں ہی خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا اب یوں بھاگتے رہنا ممکن نہیں۔ جسمانی اور ذہنی دونوں صلاحیتیں کھو چکا ہوں۔ آج تین دنوں سے سو نہیں سکا ہوں۔"

انوپما کا دل دھڑک اٹھا۔ جیون دادا چلے گئے۔

نی نی کو سُلا کر وہ بھی بستر پر پڑ گئی۔ داروغہ ریڈیو دیکھنے اندر آیا تھا یا نہیں اسے خبر نہیں۔ جب جیون دادا چلے گئے تو پھر پولیس سے خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

ماں نے آکر پوچھا ـــــ
"کچی، سنا ہے، تو نے کہا ہے کہ کھانا نہیں کھائے گی؟ کیوں، آخر ہوا کیا ہے"؟

انوپما نے ناراضگی سے کہا ـــــ
"مہاراج سے تو کہہ دیا ہے کہ بھوک نہیں ہے۔"
"بھوک نہ ہونے کی وجہ کیا ہے بھلا؟"
"ایسا کون سا کام کرتی ہوں کہ بھوک لگے؟"
"اونہہ! تو ہم جیسے دن بھر کام ہی کرتے رہتے ہیں۔ بھلا ہمیں کیسے

بھوک لگتی ہے۔ ؟
انوپما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ماں چلی گئی۔
اسے نیند نہیں آئی۔ دنیا بھر کے خیالات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے۔

اس دن انوپما نے اپنی ذہنی کیفیت کی بابت غور کیا۔ جیسے شام کے گھرے اندھیرے اس پر حاوی ہوتے چلے گئے۔ دکھ کے سیاہ بادلوں نے اس کی زندگی کو ہر طرف سے ڈھک لیا ہے۔ اس میں اس کی اپنی غلطیوں کا دخل نہیں۔ ذہن کی روشنی کہیں لامتنا ہی اندھیروں میں گم ہو گئی ہے۔ آفتاب کی طرح نور بکھیرتا دیوتا باکھر کہیں دور چلا گیا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی —— بھلا باکھر خود دور کہاں گئے ہیں ؟ میں نے ہی تو انہیں دور کر دیا ہے۔ ہاں، نی نی ہے، اڑتے بادلوں کے درمیان سے جھانک کر سکون دینے والے ایک ستارے کی طرح ہے نی نی۔
دوسری بار شادی کی پیشکش کا خیال آتے ہی اس کے سارے جسم میں کانٹوں کی چبھن سی محسوس ہونے لگی۔ اتنی گندی ذہنیت رکھنے والوں کے درمیان وہ خود ہی تو آگئی تھی۔ لیکن وہ کیوں آئی ؟
اس نے تو کہا تھا کہ وہ باکھر کے ساتھ کبھی ناانصافی نہیں کرے گی لیکن اس نے محسوس کیا کہ کتنی ناانصافی تو وہ اسی درمیان کر چکی۔ اس کا کفارہ بھی نہیں ہو سکتا۔
اگر انوپما مراجعت کرنا چاہے تو کیا یہ ممکن ہے ؟ کیا وہ پھر خیر جان لوٹ سکے گی ؟ گری اور رینو پھر اس کی بے عزتی کریں گی۔ اس کی بے عزتی کا پتی پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ پھر وہ جس گھر کو اپنی انا کی وجہ سے چھوڑ آئی وہاں کس منہ سے واپس جائے ؟

باکھر اور بوڑھے شاکیہ دونوں ہی فکر مند رہنے لگے۔ بھیم اور دریودھن کے ذریعے ایسا اقدام اٹھانے کا ان کے دل پر بہت اثر پڑا۔
شاکیہ بھیم سے بہت پیار کرتے تھے۔ جس سے لگاؤ ہو اور وہ کوئی برا کام کرے تو دل پر چوٹ لگتی ہی ہے۔ باکھر اندازہ ہی نہیں کر پاتا تھا کہ انسان

اس طرح تشدد پر اتارو ہو کر اپنے راستے سے الگ ہو سکتا ہے۔

پولیس نے کافی تلاش وجستجو کے بعد امریکن سپاہی اور بودھن کی بریدہ لاشوں کو کافی دور کٹیلی جھاڑیوں سے ڈھونڈھ نکالا تھا۔ جو سپاہی بچ نکلا تھا، اسے قید کر دیا گیا تھا۔ وقوع کے روز وہ اپنے ساتھی کے ساتھ چابو اسے آیا تھا۔ لیکن ساتھی مرگیا اور وہ بچ نکلا۔ اس نے فوجیوں کے سامنے ساری باتیں قبول کیں۔

تفتیش شروع ہوئی۔

پولیس ملازمین اور فوجی سپاہیوں کے درمیان بحث چلی۔ بات ایک کان سے دوسرے کان تک ہوتی ہوئی دور تک پھیل گئی۔ دو ہی دن میں پولیس خیر جان بگان میں آپہنچی۔ بگان کے منیجر نے بھیم اور بودھن کے فرار کی خبر دی۔ پولیس نے وزن گھر اور اس کے باہر خشک خون کے دھبّوں کی جانچ کی۔ فرار ہونے کی وجہ سے دریودھن اور بھیم کے رشتہ داروں سے تفتیش کی گئی۔ دونوں لڑکیوں کے ماں، باپ اور بہت سے لوگوں نے آنسو بہائے۔

بھیم کے مکان کی تلاشی لے کر پولیس نے بہت سے کاغذات اپنے قبضے میں کر لیے۔ باکھر اور شاکیہ سے بھی پوچھ تاچھ کی گئی۔ پولیس کے ساتھ وہی پہلے والا سی۔آئی۔ڈی۔ انسپکٹر آیا تھا۔

پولیس نے باکھر سے پوچھا ـــــ

"بھیم آپ سے لکھنا پڑھنا سیکھا کرتا تھا نا؟"

"جی ہاں، میں اُسے روز لکھنا پڑھنا سکھایا کرتا تھا۔"

"اور دریودھن"؟

"جی نہیں، دریودھن پڑھنے نہیں آتا تھا۔"

"بھلا، آپ اسے کیا کیا سکھایا کرتے تھے؟"

یہ سوال سن کر باکھر کو ہنسی آگئی۔ اس نے یقیناً سپاہی کو قتل کرنا نہیں سکھایا تھا۔ اس نے جواب دیا ـــــ

"اَ۔آ۔ک۔کھ اور قواعد بھی۔"

سی۔آئی۔ڈی افسر نے پوچھا ـــــ

" وہ ایک روز پہلے جیون بروا کیا پھرادھر آیا تھا۔؟"
باکھر نے انکار کرتے ہوئے کہا ——
" نہیں !"
افسر کسی طرف دیکھے بغیر ہنس پڑا۔ باکھر اس سے نظر نہیں ملا سکا۔
پولیس والے نے منیجر سے اس کا ذکر کیا۔ منیجر نے دفتر کے بڑے کرانی شاکیہ کو تنہائی میں بلا کر کہا ——
" شاکیہ ! پولیس کو شبہہ ہے کہ باکھر کے بہکانے پر ہی بھیم اور دریودھن نے سپاہی کا قتل کیا ہے۔ باکھر بھیم کو جنگ کے خلاف بتاتے رہتے تھے۔ جس سے اس کے دل میں نفرت پیدا ہوئی۔"
شاکیہ بے چین ہو اٹھے۔ وہ بے سہارا سے بڑے صاحب کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بڑے صاحب نے شاکیہ کے جسم پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ——
" فکر کی کوئی بات نہیں شاکیہ، باکھر کا کوئی جرم نہیں —— پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ جائیے آپ کام کیجیے۔"

شاکیہ کسی طرح بھی اپنے دل کو تسلی نہیں دے سکے۔ دن کا کام دوسروں کو سونپ کر وہ تیزی سے گھر کی جانب چل پڑے۔ ان کے دل میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ باکھر کو پولیس لے جائے گی ؟ ان کی پوری زندگی کا واحد سہارا، ان کی واحد نشانی، باکھر کو پولیس ہتھکڑی لگائے گی ؟
پورٹیکو میں لال پگڑی اور خاکی پوشاک والوں کو دیکھ کر جیسے ان پر بجلی گر پڑی۔ باکھر ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ پاس ہی داروغہ اور سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر بیٹھے ہوئے تھے۔ دو سپاہی کھڑے تھے۔ گرین اور خیر جان کے کچھ ملازم بھی کھڑے تھے۔
پولیس ملازمین نے شاکیہ کو نمسکار کیا۔ شاکیہ نے پورٹیکو میں آکر آواز دی ——
" باکھر !"

"اندر آجاییے پتا جی!"

شاکیہ کانپتے ہوئے باکھر کا ہاتھ پکڑے اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے گرین اور کئی آدمی گھس پڑے۔ پولیس ملازمین سر جھکائے رہے۔

شاکیہ کو ایک کرسی پر بٹھا کر باکھر بولا ـــــ

"پتا جی! آپ فکر نہ کریں۔ پولیس نے مجھے گرفتار کیا ہے۔ میں جانتا ہوں، میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ پھر بھی جب شبہہ ہو تو میں اس شبہے کو مٹانے کے لیے جیل جا رہا ہوں۔ امید ہے جلد ہی لوٹ کر واپس آ سکوں گا۔"

بیٹے کا ایک ہاتھ پکڑ کر شاکیہ ایک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ ان کے دونوں خشک گالوں پر گرم آنسو بہہ نکلے۔

باکھر بولا ـــــ

"آپ زندگی بھر مجھ پر اعتماد کرتے آئے ہیں۔ آپ میں خود اعتمادی ہے۔ آپ کمزوری کو پاس پھٹکنے نہ دیں۔ آپ کو چھوڑ جانے میں مجھے بھی دکھ ہو رہا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ دو چار دن بعد پھر آپ سے مل سکوں گا۔!"

اس نے پتا کے چرنوں میں جھک کر پرنام کیا۔ شاکیہ نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

باکھر نکل آیا۔ شاکیہ نے رومال سے آنکھیں خشک کر کے اٹھنا چاہا۔ گرین نے انہیں سہارا دے کر کھڑا کیا۔ غمزدہ شاکیہ پورٹیکو میں نکل آئے۔

انہوں نے کہا ـــــ

"ایک بات پوچھنا چاہتا تھا۔ گرفتار کرنے کی وجہ جاننے میں کیا کوئی رکاوٹ ہے؟"

داروغہ نے نہایت مہذب لہجے میں جواب دیا ـــــ

"جی نہیں، رکاوٹ تو کچھ نہیں ہے۔ آپ کے لڑکے پر ہم لوگوں کو کچھ شبہہ ہے۔ ہم نے انہیں مجرم نہیں بنایا ہے۔ بھیم ان سے پڑھا کرتا تھا۔ جنگ کے خلاف انہوں نے بھیم کو بتایا تھا اس کا ثبوت ملا ہے۔ بھیم کا لکھا ہوا ایک کاغذ ہمیں ملا ہے جس میں یہ باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ پھر بھیم ملٹری کو ایک دم دیکھنا نہیں چاہتا تھا، یہ بات تو سبھی کو معلوم ہے۔"

سی ۔آئی ۔ڈی ۔انسپکٹر نے کہا ——
" ایک بات اور بھی ہے کہ یہ کافی دنوں سے سرکاری آدمیوں سے جھوٹی باتیں کہتے آئے ہیں ۔جیون بروا نام کا ایک دہشت پسند اکثر آپ کے یہاں آیا کرتا ہے ۔ وہ آتا ہے ، یہ بات ایک دن بھی انہوں نے نہیں بتائی حالانکہ اس کے آنے کے بارے میں ہمیں پتہ چل جاتا تھا ۔ دہشت پسند کو پناہ دینا بہت بڑا جرم ہے ۔جیون بروا کو کل ہی ڈبروگڑھ میں گرفتار کیا گیا ہے۔"
باکھر دنگ رہ گیا ۔جیون دادا پکڑے گئے ۔
انسپکٹر نے ہنس کر کہا ——
" جیون بروا جب آخری بار یہاں آیا تھا تو ذرا سی تاخیر ہو جانے کے باعث ہم اسے گرفتار نہیں کر سکے ۔ مگر ہمارے آدمی اس کا پیچھا کرتے اس کے گھر تک پہنچے تھے ۔ وہاں سے بھی فرار ہو کر وہ ڈبروگڑھ پہنچا تھا مگر آخر کار پکڑا گیا۔"
شاکیہ اپنے اس جیون بیٹے کے بارے میں سوچ رہے تھے تو وہ اسے پہچان نہیں پائے تھے ۔
داروغہ بولا ——
" شاکیہ جی ! آپ سے ایسا برتاؤ کرنا پڑا ۔ اس کے لیے ہمیں افسوس ہے ۔ فرض پورا کیے بغیر بھی تو چارہ نہیں ۔آپ کے بیٹے کو جلدی لوٹا سکوں تبھی میں سُرخ رو ہو سکوں گا۔"
شاکیہ نے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ——
"جاؤ !"
پولیس والے باکھر کو لے کر جیپ پر سوار ہو گئے ۔

گرین ڈھڈمانہ جا کر کھانا بنانے میں جٹ گیا ۔
شاکیہ پورٹیکو میں بیٹھے باہر ہی کی جانب ایک ٹک دیکھتے رہے ۔ اندھیرا زمین پر اپنی چادر پھیلاتا جا رہا ہے ۔انہیں محسوس ہوا کہ تاریکی ان کے سینے میں بھی در آئی ۔

شام کو جانے والی گاڑی سے باکھر کو ڈبر وگڑھ لے جایا جائے گا۔ محرر یودک شرما کو شاکیہ کے پاس چھوڑ کر گرین کچھ لانے کے بہانے ڈنڈما پہنچا۔ اسٹیشن پر باکھر کو گھیرے نرکانت بروا، گری، رینو، کچھ ساتھی اساتذہ اور کچھ طالب علم کھڑے تھے۔ بروا داروغہ سے بحث کر رہے تھے۔ ضمانت کیوں نہیں دی جائے گی؟ گری باکھر کے ہاتھ پکڑے کچھ کہہ رہی تھی۔ رینو کا چہرہ دھواں دھواں! باکھر نے گرین سے کہا ــــــ

"گرین بھائی! تم ذرا پتاجی کی دیکھ بھال کرنا۔ درمیان میں وہاں جاتے رہنا۔ ہو سکے تو ایک رسوئیا کا انتظام کر دینا۔"

گرین بولا ــــــ

"آپ فکر نہ کریں بھیّا۔ میں اب سے وہیں رہوں گا۔ آپ خط لکھ دیں گے۔"

باکھر گری کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔

کہیں سے نظام آنکلا۔ باکھر نے نظام کو باتھوں میں بھر کر کہا ــــــ

"ارے بھائی اب چل رہا ہوں۔"

نظام نے اسے دلاسہ اور تسلی دیتے ہوئے بہت سی باتیں کہیں۔

گاڑی آئی باکھر کو لے کر چلی گئی۔

دل گرفتہ گرین خیر جان لوٹا۔ رسوئی میں جو بنانا باقی تھا وہ بنانے لگا۔ شاکیہ منہ ہاتھ دھو کر چپ چاپ اندر بیٹھے رہے۔ گرین کام کر رہا تھا۔ لیکن اس کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا ــــــ بوڑھے شاکیہ کی بھلا کیا حالت ہو گی؟ دھرم پتنی چل بسی، بیٹی کو شادی کر کے رخصت کر دیا۔ بہو آتی نہیں۔ بھیم بھاگ گیا۔ باکھر کو پکڑ لے گئے۔ بوڑھے اور کمزور انسان کی چھوٹی سی دنیا اس طرح اجڑ جائے تو بھلا وہ کیسے رہ سکے گا۔

اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ وہ احسان فراموشی نہیں کرے گا۔ ماضی کے احسان کا بدلہ چکائے گا۔ اس مشکل وقت میں وہ موسا کو چھوڑ نہیں جائے گا۔ یہیں رہ کر ٹھیکے کا کام کرتا رہے گا۔ اس نے بہت سے برے کام کیے ہیں، غیر انسانی کام بھی کیے ہیں لیکن اس میں اب بھی انسانیت باقی ہے۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا۔

دوسرے دن شاکیہ کو بخار آ گیا۔ رات کو کافی اصرار کرنے کے باوجود انہیں کھانے پر آمادہ نہیں کر سکا۔ رات بھر سوئے بھی نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے آکر دوا دی۔ منیجر صاحب نے آکر تسلی دی۔ گرین خدمت میں لگا رہا۔ بڑے صاحب نے خود ہی ایک نوکر کا انتظام کر دیا۔

نرکانت بروا، گری، رینو، بدرالدین اور نظام آتے۔ گرین نے دوا دارو کے بارے میں گرین سے دریافت کیا۔ وہ رینو کو ساتھ لے کر دن میں دو دو بار آیا کرتی۔

شاکیہ جلد ہی اچھے ہو گئے معمول کے مطابق کام پر جانے لگے۔ گرین بھی دونوں وقت رسوئی بناتا اور ٹھیکے کا کام کرتا۔ وہ ایک باورچی کی تلاش میں تھا۔ شاکیہ گرین اور گری کو منع کرتے، باکھر کے بارے میں بہو اور بیٹی کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔ باکھر جلد ہی واپس آ سکتا ہے۔ اس کو بے کار پریشان کرنا اچھا نہیں۔

خیر جان کے مزدور خبریں کر آتے۔ انہیں فیلڈ میں امریکن سپاہی آج کل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ عام طور پر مزدوروں کو دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ لیکن خیر جان کے مزدور انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ وہ بات بات میں خیر جان کے مزدوروں کو جھڑکیاں دیتے رہتے ہیں۔

جو سپاہی بچ کر بھاگا تھا، سننے میں آیا ہے اسے اس کے عہدے سے نیچے اتار دیا گیا ہے۔ کارپورل سے پرائیوٹ میں، اور دو مہینے کی سزا بھی ہوئی ہے۔

سنا ہے ایک سپاہی نے گھونسہ تان کر کہا تھا —— مارے گا۔

گرین سوچتا —— کیا ملٹری والے بدلہ لیں گے ؟

شاکیہ ہر شام کو کیرتن پڑھنے لگے تھے۔ رات کو اکثر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ گرین کے زور دینے پر ہنس کر کہتے ——

" اب تو ہمارے جانے کا وقت ہو گیا ہے بیٹے! کھاؤ، تم سب جوان لوگ کھاؤ۔ ہم بھلا اب کتنے دن رہیں گے۔؟"

گرین فکر مند ہو گیا۔ باکھر کا بھی کوئی خط نہیں آتا۔

شاکیہ نے کہا ——

"گریندر، جوانی میں دولت کمار ہا ہے کما! ناانصافی کر رہا ہے کر، روکنے کا اختیار مجھے نہیں ہے۔ میں اس بڑھاپے میں پاپ کی دلدل میں اترا۔ تجھے گیان دینے کی شکتی میرے اندر نہیں ہے۔ پھر بھی میرا من کہتا ہے، سنسار کا موہ بہت بُرا ہے۔ بڑا ہی بُرا! اس کے جال میں پھنسنے پر الجھنوں کے علاوہ اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ میری زندگی موہ میں گم ہوگئی تھی۔ آج بہت دیر بعد یہ بات سمجھ میں آئی ہے۔ اس سے مکتی مل سکتی ہے یا نہیں، اس کا بھی مجھے علم نہیں ہے، مگر اجامل[1]، کو تو 'ہری' نام لیتے ہی مکتی مل گئی تھی۔ 'اجامل' تو مہا پاپی تھا۔ اب مجھے بھی ایشور کرپا کر کے اپنے پاس بلا لیتا۔"

وہ 'کیرتن[2]' پڑھتے رہتے۔

گرین کا من مرجھا جاتا۔

آخر سچ مچ شاکیہ کو مکتی مل گئی۔ وہ بھی ایک دردناک کہانی ہے۔

ایک ہفتے تک باکھر کی جانب سے کوئی خط یا خبر نہ ملنے پر شاکیہ نے ایک دن کہا ——

"گریندر، تو، کیا ایک بار ڈبروگڑھ سے ہو آ سکتا ہے؟ دیکھتا ہوں کہ باکھر کی کوئی خیر خبر نہیں آتی۔"

اس غرض سے گرین ایک دن سویرے ڈبروگڑھ نکل گیا۔ سوچا تھا کہ شام تک لوٹ آئے گا۔ رسوئی بنانے کی ذمے داری نوجوان محرر شرما کے ذمے سونپ دی۔ لیکن گرین کسی بھی طرح سے اس روز واپس نہیں آ سکا۔

۱۔ اَجامِل: پرانوں کے مطابق اجامل مہا پاپی تھا۔ وہ کبھی بھگوان کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کے لڑکے کا نام 'نارائن' تھا۔ مرتے وقت جب اس نے اپنے لڑکے کا نام 'نارائن، نارائن' لے کر پکارا تو اسے مکتی مل گئی۔

۲۔ کیرتن: شنکر دیو کی مشہور کتاب۔

باکھر کی کوئی خبر نہیں ملی۔ جیل کے دروازے پر دھرنا دے دے کر بھی کوئی خبر نہیں مل سکی۔

رات کو تین بجے کی گاڑی سے وہ لوٹ رہا تھا۔ رات بھر سو نہیں سکا۔ کام تو کچھ ہوا ہی نہیں۔ اسے بہت مایوسی ہوئی۔ اتنی کوشش کے باوجود بھی کوئی خبر نہیں لے سکا۔ یہ جیل والے بھی کیسے انسان ہیں۔ ایک بے قصور انسان کو یوں ہی پکڑے گئے اس پر سے کوئی خیر خبر بھی نہیں دیتے۔ وہ بھلا پھوپھا جی کو کیا بتائے گا؟

وہ خیر جان پہنچا تو کہرے کو چیر کر دھوپ نکل آئی تھی۔

مگر ـــــــ

شاکیہ کا مکان جل کر خاک ہو چکا تھا۔ چھت کے ٹین جل کر ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ کھڑکی دروازے نیست و نابود ہو گئے تھے۔ بھیم کا گھر بھی راکھ ہو چکا تھا۔ اب تک اس سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ بچی دیواریں جھلس کر سیاہ ہو گئی تھیں۔ وہاں قرب و جوار میں کوئی جاندار نہیں تھا۔

وہ پاگلوں کی طرح پھوپھا جی، پھوپھا جی، چیختا ہوا دوڑ کر بغیر چھت کے مکان میں گھس گیا۔ صندوقیں الٹی پڑی تھیں۔ اندر صرف راکھ ہی راکھ تھی۔ کرسی میزوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ باکھر کی کتابوں کے چند اوراق ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ شاید آگ بجھاتے وقت پانی پڑنے کی وجہ سے بچ گئے تھے۔ ادھ جلے کپڑے بھی پڑے ہوئے تھے۔

وہ پورٹیکو والے زینے پر بیٹھ کر رونے لگا۔ یہ سب کیسے ہو گیا؟ یہ سب کیا ہو گیا؟ اسکی خبر لینے کی ہمت بھی اس میں نہیں تھی۔

شرما اسی طرف سے جا رہا تھا۔ گرین کو دیکھ کر 'حاضر کا' کہتا ہوا پاس آگیا۔ گرین لپک کر کھڑا ہو گیا۔ شرما کو پکڑ کر پوچھا ـــــــ

"یہ سب کیا ہو گیا۔؟"

شرما نے سر جھکا لیا۔ کہا ـــــــ

"کیا بتاؤں حاضر کا! چلیے اسپتال چلیں۔ وہ وہیں ہیں۔ راستے میں ساری بات بتاؤں گا۔"

دونوں چل پڑے۔ شرما کہتا گیا ——

وہ کھانا بنا کر شاکیہ کو کھلانے پلانے کے بعد تقریباً 9 بجے اپنے گھر چلا گیا تھا۔ وہ رات کو وہیں سونا چاہتا تھا کیونکہ نوکر شام کو ہمیشہ لائن میں چلا جاتا تھا لیکن شاکیہ نے کہا کوئی ضرورت نہیں ہے، اور اسے زبردستی گھر بھیج دیا۔ شرما کے جاتے وقت شاکیہ دو صندوقوں پر مٹی کے دیے جلا کر کیرتن پڑھ رہے تھے۔

تقریباً دو گھنٹوں بعد لوگوں کی چیخ و پکار سن کر شرما جب بے تحاشہ دوڑتا ہوا نکلا تو اس وقت شاکیہ کا مکان دھوُ دھوُ جل رہا تھا۔ آگ کی لپٹیں آسمان چھو رہی تھیں۔ بہت سے لوگ اِدھر اُدھر دوڑ کر آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن پورے مکان پر پیٹرول چھڑک دیا گیا تھا اسی لیے ایک لمحے میں اتنا عظیم الشان پختہ مکان جل کر خاک ہو گیا۔ منیجر صاحب آکر بے تحاشہ اندر گھسنا چاہتے تھے تاکہ شاکیہ کو بچا سکیں جو پتہ نہیں اندر کس حالت میں تھے۔

اسٹیرپ پمپ اور بالٹیوں سے مسلسل پانی ڈالا جا رہا تھا۔ لیکن یہ آگ ایسی تھی جسے بجھانا ممکن نہیں تھا۔ لوگ 'رام رام' کرنے لگے تھے۔

پورٹیکو کا دروازہ کھول کر شاکیہ باہر آرہے تھے۔ اچانک جلتا ہوا لکڑی کا ٹکڑا ان کے سر پر گر پڑا۔ وہ گر گئے۔ لوگ چیخنے لگے۔ بڑے صاحب لپک کر آگ کی لپٹوں سے گزرتے ہوئے ان کے قریب پہنچے۔ تبھی کچھ اور لوگ پہنچ گئے اور بے ہوش شاکیہ کو پکڑ کر باہر لے آئے۔

شاکیہ کے سر اور سینے پر سخت چوٹیں آئی تھیں۔ ریڑھ کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں انہیں فوراً بڑے صاحب کی موٹر پر اسپتال بھیج دیا گیا۔ سویرے تک شاکیہ کو ہوش نہیں آیا تھا۔

رومال سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے شرما نے کہا ——

ڈاکٹر نے کہا ہے، ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ہوش نہیں آسکتا۔ ہوش آنے پر بھی دو چار منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔

راستے میں ہی گرین پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

شعلوں کی روشنی میں کارخانے کے ایک چوکیدار نے تین امریکن سپاہیوں کو جیپ پر چڑھ کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا ــــ شرما نے بتایا۔

اسپتال کے برآمدے میں خیرجان کے کئی ملازم گرین کو ملے۔ بڑے صاحب بھی تھے۔ انہوں نے کہا ــــ

" میں نے تھانے میں فون کیا ہے۔ باکھر کہاں ہے؟ جیسے بھی ممکن ہو پتہ لگانے کو کہا ہے۔ آپ باکھر کی پتنی کو تار دے دیں۔ ساری باتیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ صرف جلد آنے کو لکھیں "

نو بجے شاکیہ نے آخری سانس لی۔

مرتے وقت انہوں نے صرف 'باکھر' 'بیٹی' اور گریلا' کا نام لیا تھا۔ گرین کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ گری رو پڑی، بڑے صاحب نے رومال سے آنسو خشک کیے۔ منگرا اور بکل چپکے چپکے باہر روئے۔

آخری رسومات انجام دینے کے بعد گرین کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بالکل بے سہارا ہو گیا ہے۔ وہ اداس اور دل برداشتہ ڈنڈما چلا آیا۔ تھانے میں باکھر کے بارے میں دریافت کیا لیکن داروغہ کوئی خبر نہیں دے سکے۔ گرین، بدرالدین کے یہاں گیا۔ کہا ــــ

" تم سارا حساب کتاب ٹھیک کرو۔ اب میں ٹھیکیداری نہیں کروں گا۔ پھوپھاجی کا کام ختم کرکے واپس گھر لوٹ جاؤں گا۔

گوہاٹی جیل کے اندر ایک دن سویرے باکھر دھوپ میں بیٹھا چیخوف کی کہانیاں پڑھ رہا تھا۔ ایک ہفتہ قبل اسے یہاں لایا گیا تھا۔ گھر سے کوئی خط وغیرہ اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ وہ خط لکھتا رہا ہے۔ لیکن اِس جیل سے اُس جیل میں تبادلہ ہونے کی وجہ سے ہی شاید اسے کسی کا جواب نہیں مل سکا۔

تھوڑی دور پر بیٹھا ہوا ایک قیدی کافی دیر سے اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ لمبے قد کا دبلا پتلا سا آدمی، بال بکھرے ہوئے۔ داڑھی مونچھیں کافی

بڑھ جانے کی وجہ سے چہرہ چھپ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ شخص اتنی دیر سے اسے کیوں دیکھ رہا ہے ؟ پہلے تو اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا مگر آخر میں کچھ توجہ دے کر اسے دیکھنے گیا۔

اسں آدمی کی وہ دو آنکھیں ؟

' جیون دا ' ؟ اچانک چیخ کر کھڑا ہو گیا۔ دوڑتے ہوئے آکر قیدی نے باکھر کو بانہوں میں بھر لیا۔ کہا ـــــ

" جیون دادا، ہاں، شاکیہ، جیون دادا ! آپ جیل میں مل کر مجھے حیرت زدہ کر دیں گے، یہ بات میں نے خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔ آپ چور ڈاکو ہیں نہ میرے جیسے انقلابی ہی۔ داڑھی مونچھوں بھرے چہرے نے آپ کو میرے لیے اجنبی بنا دیا۔ مجھے نقوش جانے پہچانے سے لگ رہے تھے لیکن میں ٹھیک سے پہچان نہیں پا رہا تھا۔

دونوں دو پتھروں پر بیٹھ گئے۔

باکھر نے جیل میں آنے کا حادثہ کہہ سنایا۔ جیون دادا نے ' ہا ہا، ہا ہا ' کر کے قہقہہ لگایا۔ باکھر حیرت زدہ تھا۔ جیون دادا آخر ہنس کیوں رہے ہیں ؟ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سسک سسک کر رونے لگے۔ دوسری بار حیرت زدہ ہو کر باکھر نے ان کے جسم پر ہاتھ رکھ کر پکارا ـــــ

" بردا "

جیون دادا نے دھیرے دھیرے کہا ـــــ

" شاکیہ ! میں نے بہت پہلے ہی اندازہ کیا تھا کہ مجھے ایک دن یونہی رونا پڑے گا۔ میری ہی وجہ سے آج آپ جیل میں ہیں۔ میں اگر خیر جان میں پناہ نہ لیتا تو پولیس کبھی آپ کو تنگ نہ کرتی۔ خیر جان جاتے وقت مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس میرے پیچھے ہے۔ میں جانتا تھا کہ آپ مشکل میں پڑ جائینگے لیکن میں پکڑا نہ جاؤں گا۔ یہی سوچ کر یہ ناانصافیاں کرتا گھوم رہا تھا۔ تخریب کرنا ہی جس کا مقصد ہے اسے انصاف اور ناانصافی کا احساس ہی نہیں رہتا مقصد کے علاوہ چھوٹی بڑی تمام باتوں سے ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

باکھر نے کہا ـــــ

"آپ غلط کہتے ہیں بروا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے کوئی ناانصافی نہیں کی۔ پولیس اگر انصاف کرے تو مجھے آزاد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ انقلابی کو پناہ دینے کی وجہ سے مجھے جیل جانا پڑے تو مجھے خوشی ہی ہوگی۔ میں آپ کی پارٹی کا فرد نہیں لیکن آپ جو بدامنی لانا چاہتے ہیں ــــــ اس پر مجھے یقین ہے۔ تو پھر اپنے اعتماد اور سچائی کی وجہ سے ہی میں جیل جاؤں گا۔ آپ کے جرم کی وجہ سے نہیں۔"

جیون دادا نے آنسو پونچھ کر باکھر کی طرف دیکھا۔ پھر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا ــــــ

"شاکیہ! آپ مہان ہیں۔ اسی لئے ایسا کہتے ہیں! ہم محض دھول پھانکنے والے آدمی ٹھہرے۔ اپنا جرم محسوس کرتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ بات چھپانی نہیں چاہیے۔"

"بروا مجھے بڑا کہہ کر چھوٹا نہ بنائیں۔ میں تو اپاہج ہوں، مجبور دبے بس ہوں۔ دیش اور سماج کے لیے میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ کمزور آدمی کی طرح دکھ سکھ کا احساس کرکے ہی زندگی گزاری۔ میں آدمی ہوں لیکن مکمل انسان نہیں۔

دادا انوپما کا ذکر کرنا چاہتے تھے لیکن اس سے قبل ہی باکھر نے بتایا کہ گھر سے کوئی خبر نہیں آتی۔ جیون دادا نے اپنی بات ملتوی کرکے کہا ــــــ

"کیا سچ! ٹھیک ہے! میں کوشش کرتا ہوں۔ دیکھو کیا کر پاتا ہوں۔ اسمگل کرنا ہوگا شاکیہ، پھر جرم کرنا ہوگا۔ چوری چھپے خبر لانی پڑے گی۔ آپ کو بغیر کسی جرم کے قید کر رکھا ہے اس لیے میں ہی چوری چھپے خبر لاؤں گا۔ یہی ہمارا اصول ہے۔ ٹام۔ پال جان اگر رائفل چلائیں تو ہم کم از کم بندوق تو اٹھا ہی لیں گے۔"

اس کے بعد خبر لانے کی فکر میں جیون دادا سارے جیل کا چکر لگانے لگے۔ مسلسل سوچتے رہے۔ دو چار دن باکھر سے باتیں نہیں کیں۔ باکھر حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ کس فکر میں ڈوبے وہ دن رات گزار رہے تھے، باکھر سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

تیسرے دن انہوں نے کہا ــــــ

" بائیں طرف کے پاخانے کے داہنی جانب کی لکڑی کی اوٹ میں تلاش کر دیکھے گا۔ مجھے تو شاید یہاں سے لے جائیں گے۔ ایک مہتر جمعدار کو ذمہ داری سونپی ہے۔ وہ تیار ہو گیا ہے جانے سے قبل خبر مجھے بھی مل جاتی تو اچھا تھا لیکن میں جب ذرا سنجیدگی سے فکر کرنے لگتا ہوں تو یہ مجھے دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں۔ دیکھئے نہ، مار پیٹ کر خوب صورت جسم کو کس طرح برباد کر لیا ہے۔

باکھر کو ایک کاغذ متعینہ مقام پر ملا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کاغذ موڑ کر منہ میں ڈالا اور لے آیا۔ سوتے وقت دھول کے اندر گاڑ دیا۔ سویرے ایک قیدی سے اخبار مانگ لایا اور اسی کے درمیان خط رکھ کر دھوپ میں آبیٹھا۔ اس میں لکھا تھا ــــــ

باکھر کو لے جانے کے بعد پتاجی بہت اداس ہو گئے۔ چوکیرٹی کے سپاہی بدلہ لینے کی تاک میں تھے۔ ان سب نے بھیم کا گھر تلاش کر لیا تھا۔ ایک دن آدھی رات کو تین امریکن سپاہیوں نے پٹرول چھڑک کر مکان میں آگ لگا دی آگ بجھائی نہیں جا سکی۔ باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے پتاجی کے جسم پر جلتا ہوا لکڑی کا ٹکڑا اگر پڑا اور وہ بری طرح زخمی ہو گئے۔ دوسرے دن اسپتال میں ان کی موت ہو گئی۔ گرین ہمیشہ ان کے ساتھ ہی رہتا تھا مگر اس کی غیر موجودگی میں یہ حادثہ ہوا۔

اب تو کچھ بھی نہیں بچا۔

باکھر رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پتاجی نہیں رہے۔ ساری مایا چھوڑ کر چلے گئے۔ مرتے وقت ان کے پاس نہیں رہ پایا۔ اس بڑے مکان میں تنہا جل مرے۔ دنیا کا مایا موہ بالکل بے کار ہے۔ یہ بات ایک بار پھر وہ ثابت کر گئے۔ ان کی پتنی کبھی کی چل بسی تھیں۔ نیا بنایا ہوا مکان پڑا رہ گیا۔ لڑکی کو کچھ بھی پتہ نہیں چلا۔ لڑکے کو خبر نہیں ملی۔ بہو خبر لینے نہیں آئی۔ وہ سر پر ہاتھ رکھے سر جھکائے کاغذ کی طرف دیکھتا رہا۔ جیون دادا پاس آئے۔ پاس بیٹھ کر میگزین کی اوٹ سے انہوں نے بھی پرزے کو پڑھا۔

جلتی ہوئی سگریٹ کی آگ سے اس پرزے کو جلاتے ہوئے جیون دادا
نے کہا ـــــ
" میرے آنسو خشک ہو چکے ہیں شاکیہ! پہلے رونا جانتا تھا۔ آج سوچتا
ہوں کہ پتاجی کے لیے کیسے رویا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہیں غلط ڈھنگ سے
نہ رو پڑوں اس لیے خاموش ہوں۔ دعا نام کی چیز آج کل کچھ کچھ سیکھ رہا ہوں
ان کے لیے دعا کروں گا۔ ان کی آتما کو شانتی ملے۔

دوسرے دن باکھر کو جیل سے چھٹکارا ملا۔ بوجھل دل سے اس نے جیل
کے دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔ پہلے کی بغیر بنائی داڑھی اور بڑھ گئی تھی۔
جیون دادا نے ہاتھ پکڑ کر کہا ـــــ
" شاکیہ آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ مجھے آج رشک آ رہا ہے۔ آپ کے
پتاجی نے جو محبت پائی ہے وہ محبت پانے کے لیے میں بے تاب ہو رہا ہوں۔
گھر میں تو اس جیون کو کوئی پھوٹی آنکھ بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں ایک
غیر ضروری اور بے کار محض آدمی ہوں۔ اگر میں مر جاؤں تو دو بوند آنسو بہا دیجیے گا۔
اچھا جایئے۔"
باکھر درد بھری نظر سے جیون دادا کو ایک بار دیکھ کر چلا گیا۔

انوپما کے لیے مائکہ زہر بن چکا تھا۔ گھر کا کوئی بھی فرد اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ پتاجی تو شائد بس اخلاقاً ہی 'تو میرے گھر سے نکل جا' نہیں کہہ پاتے تھے۔ ہمیشہ جھگڑے کی وجہ سے ماں ہی اسے کوسنے لگیں تھیں۔ وہ کبھی کبھی سوچتی کہ خیر جان چلی جائے۔ گرین کا تار ملتے ہی اسے چلا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اتنے دنوں اس نے کوئی خیر خبر نہیں لی۔ پھر باکھر نے کئی مہینے سے کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ بھلا وہ جائے تو کیسے جائے؟

لیکن پتاجی کی زیادتیاں کب تک برداشت کرتی رہے۔ ایک دن شام کو پتاجی نے کہا ـــــ

"دیکھ ککی! بڈھے کی بات سن، کئی مہینے سے باکھر کی کوئی خیر نہیں، اسے چھوڑ۔ تو، تو سماج نہیں مانتی، اگر مانتی ہوتی تو خیر جان چھوڑ کر نہیں آتی۔ بس بھی سماج نہیں مانتا۔ تیری دوسری شادی کروانے میں، میں برہما کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔"

انوپما نے غصّے سے کہا ـــــ

"میں سماج مانتی ہوں۔ میں آپ کو نہیں مانتی۔ آپ زبردستی میری شادی نہیں کروا سکتے۔" کہہ کر وہ تیزی سے وہاں سے چلی آئی تھی۔

کچھ دیر بعد پتا نے اسے بلایا ـــــ

"ککی، ادھر آ تو، ڈمڈما سے کسی کا فون ہے۔ کوئی گرین ہے۔ مجھ سے تو کچھ کہتا نہیں۔ تجھے ہی بلا رہا ہے۔"

ڈمڈما سے فون کی بات سن کر وہ پتاجی کے پاس آئی اور ریسور اٹھا لیا۔

گرین کا فون تھا ــــــ

"میں گرین ہوں - میرا تار ملا ہے یا نہیں"؟

"ملا ہے"۔

"تو بھی نہیں آئیں؟ تم نہ جانے کیا ہو بھابی - اتنے حادثے گزر گئے - تم کیا سمجھو گی بھابی! باکھر بھیا نہیں ہیں - پھوپھاجی بھی نہیں رہے"۔

گرین کا گلا رندھ گیا - انو پما کا دل دھڑک اٹھا - پوچھا ــــــ

"کیا ہوا ہے گرین، بتاؤ؟"

"کس زبان سے بتاؤں بھابی؟"

مگر گرین نے دو منٹ میں ساری باتیں کہہ دیں - اور اس نے فوراً چلے آنے کی درخواست کی۔

انو پما کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ پڑا۔ باکھر جیل میں، پتاجی گھر میں جل مرے - اس کی آنکھیں پھیلی رہ گئیں - اپنے دل سے وہ بار بار پوچھنے لگی ــــــ تو انسان ہے یا پتھر؟

اس کے پتا حیرت زدہ تھے - پوچھا ــــــ

"بات کیا ہے کئی؟"

وہ آنچل سے آنکھیں ڈھک کر بے حس سی روتی ہوئی پتا کے پاس سے چلی آئی۔ نی نی کو لے آئی - اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے بیٹی کو گود میں لیے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی - نی نی بھی روتی رہی - دروازے پر دستکیں دے کر ماں باپ اسے پکارتے رہے - لیکن اس طرف دھیان دیے بغیر اس نے نی نی کو صاف ستھرے کپڑے، جوتے، موزے پہنا کر چہرے پر پاؤڈر لگا کر بال سنوارے۔ پھر سوٹ کیس کھول کر کپڑے لتے بھرنے لگی۔ دروازے پر جب زیادہ چوٹیں پڑنے لگیں تو انو پما نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا لیکن پلٹ کر جلدی جلدی کپڑے لتے بھرنے میں مصروف ہو گئی۔ نی نی چپ چاپ بستر پر پڑی تھی - وہ سمجھ گئی تھی کہ کہیں جانا ہے۔

"کئی"! ــــــ پتاجی نے پوچھا ــــــ 'بھلا تو چلی کہاں؟ فون سے کیا خبر آئی ہے؟ بتا تو آخر ہوا کیا ہے۔؟"

ماں نے پوچھا ــــ
"کیا ہوا ہے، بتانا؟"
انوپما نے شائستگی سے کہا ــــ
"میں خیر جان جا رہی ہوں۔ ملٹری نے وہاں کا مکان جلا دیا ہے۔ پتاجی اسی میں جل مرے اور انہیں تو پتاجی کے سامنے ہی پکڑ کر جیل لے گئے تھے۔ جیون دادا کو پناہ دینے کے جرم میں انہیں گرفتار کیا ہے۔ مجھے موٹر اور ڈرائیور چاہیے۔"
ماں باپ حیرت زدہ رہ گئے۔ ماں نے نی نی کو اٹھا لیا۔ پتا بولے ــــ
"رام رام، یہ خبر مجھے نہیں ملی۔ ٹھیک ہے ٹھہر! میں سب انتظام کر دیتا ہوں۔ میں اور تیری ماں بھی ساتھ چلیں گے۔ تو ذرا اطمینان رکھ۔"
انوپما نے کہا ــــ
"میں بالکل مطمئن ہوں۔ میرے ساتھ کسی کو جانے کی ضرورت نہیں ــــ میرے پتی کے تئیں جن کے دل میں خلوص نہیں ہے، میں بھی ان کا احترام نہیں کر سکتی۔ میرے ساتھ کسی کی محبت کا اظہار نہیں ہوتا۔"
ماں باپ دنگ رہ گئے۔
انوپما نی نی کو لے کر سوار ہو گئی۔
چلتی ہوئی موٹر پر سوار انوپما پاکھر کا تصور کرنے لگی۔ گود میں بیٹھی ہوئی نی نی کو بھی اس نے فراموش کر دیا۔ میں نے کہا تھا، آپ کے تئیں کوئی ناانصافی نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں ــــ میں نے کافی زیادتیاں کی ہیں جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اپنی زیادتی کی وجہ سے ہی میں نے پتاجی کو کھو دیا ہے۔ خود بھی بے عزت ہوئی۔ کیا آپ کو بھی میں کھو بیٹھوں گی؟ آپ کی نصف بہتر ہونے کے باوجود آپ کو پہچان نہیں سکی۔ کیا آپ کو پا سکوں گی؟ دیوتا میرے! میرے دیوتا، کہنے کا بھی کیا مجھے حق ہے؟
دور افق کو دیکھتے ہوئے وہ پاکھر کے بارے میں سوچتی رہی۔ بادلوں کے ٹکڑے ہوا کے تیز جھونکوں کے دوش پر پورب کی طرف اڑتے چلے جا رہے تھے۔ نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بادل بالکل چھٹ جائیں؟ امیدوں کے

اس آکاش کا نظارہ کرنے کا کیا مجھے حق حاصل ہے ؟ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
ماں کا کربناک چہرہ اور ڈبڈبائی آنکھیں دیکھ کر نی نی کے چہرے پر بھی غم کی گھٹا چھا گئی۔ انوپما نے اسے سینے سے لگا لیا۔

ڈنڈما اسٹیشن پر باکھر کو گرین اور نظام مل گئے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر نظام کی مانوس ہنسی رک گئی اور گرین کا دل رو پڑا۔ لیکن باکھر کے صبر و تحمل نے اسے سہارا دیا۔ اس وقت دن کے تقریباً دو بجے تھے۔ گرین اور نظام کے کافی اصرار کرنے کے باوجود باکھر ڈنڈما میں کچھ بھی کھانے کو تیار نہیں ہوا۔
راہ چلتے اس نے پتا جی کے بارے میں دریافت کیا۔ کرید کرید کر پوچھنے پر اس نے ساری باتیں جان لیں۔ باکھر کو تسلی دے کر ان دونوں کو بھی اطمینان ہوا۔
جلے ہوئے مکان کے پاس دونوں کھڑے ہو گئے۔ خاک آلود کالی دیواریں کھڑی تھیں۔ اوپر کا چھپر نہیں تھا۔ کوئی آدمی آدم زاد نہیں تھا۔ صرف چھپی ہوئی کہیں ایک بلی نکل کر بھاگ گئی۔ بھیم کے مکان کی جگہ جلے بانس اور پھوس کی محض راکھ پڑی ہوئی تھی۔ نالے کی طرف کا باہری دروازہ جیوں تیوں تھا۔ میل بھر پھیلے ہوئے نالے کا ٹھہراؤ بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ پھاوڑے سے کھودی ہوئی باڑی کی وسیع زمین نے باکھر کے دل کو کافی تسلی دی۔ وہاں کچھ گھنٹے تنہا بیٹھنے کی خواہش ہوئی۔
اسی لیے گرین نے جب انوپما کو فون کرنے کی بات بتائی تو اس نے ایک طرح سے زبردستی ہی نظام اور گرین کو ڈنڈما بھیج دیا۔ شاید انوپما آئے۔ ان دونوں نے شرما کے یہاں جاکر باکھر کا انتظام کرنے کو کہا اور خواہش نہ ہونے کے باوجود ڈنڈما گئے۔ باکھر نے ایک بار گھر پر نظر ڈالی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔
اس نے باڑی کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ نالے میں بھی کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر بھی اس 'کچھ بھی نہیں' میں ہی اسے رہنا پڑے گا۔ وہ آگے آ گیا۔
پھاوڑے سے کھودی ہوئی باڑی کی زمین پر چل کر دروازے کے قریب ایک پیپتے کے پیڑ کے نیچے وہ بیٹھ گیا۔ ڈوبتے سورج کی دھوپ اس کی پشت پر پڑ رہی تھی۔
دور نشیب میں بہتی ہوئی ندی بھی پہلے جیسی ہی تھی۔ دور کی ڈھلان میں کچھ پیڑ تھے۔ ان کے سائے نظر آ رہے تھے۔ ندی کنارے سفید کانس کے پھول

کھلے تھے۔ پھر بھی اسے پہلے جیسا اچھا نہیں لگا۔ اس نے پھر مکان کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ملبہ وہیں پڑا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پھر وہاں پہلے جیسا ہی مکان بنے، ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی خوبصورت مکان بنے لیکن وہاں پتاجی تو نہیں ہوں گے۔ اس لیے اس خوبصورت مکان کی کچھ قیمت بھی اس کی نظر میں نہیں ہے۔ کتنا ہی خوبصورت ہو لیکن پریم جیسی حسین کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔

دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے، وہ پتاجی کی اور ماضی کی باتیں سوچتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ محبت اور پیار کی یہ کڑیاں کتنی قیمتی ہیں۔ ان سے محرومی پر اس کا دل بھر آیا تھا۔ ان چیزوں کے درمیان رہ کر اس نے کتنی بے فکری سے زندگی کے دن گزارے تھے۔ اگر وہ ساری چیزیں نہیں ہوتیں تو وہ بھی آج کا انسان نہیں ہوتا لیکن اب وہ سب کچھ کھو گیا ہے۔

پتاجی چلے گئے۔ دنیا میں بھلے ہی کوئی اس پر اعتماد نہ کرے لیکن پتاجی نے کبھی اس پر شک نہیں کیا۔ سبھی اسے چھوڑ گئے تھے لیکن پتاجی نہیں۔

اور تو اور انوپما بھی جا کر کھو گئی۔ اس کی جوانی کے من مندر کی دیوی۔ جیون کے ڈور کے دوسرے سرے سے بندھی ہوئی اس کی ہمدم و دمساز۔ اس کے علاوہ وہ کسی دوسری عورت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کٹی بھلے ہی چھوڑ جائے، بھلے ہی کٹی مر جائے، وہ اسے اپنی کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ تو کچھ بھی بن نہیں پایا۔ ڈنڈما کی بہتی ہوئی رَو میں وہ خود کو بہا نہیں سکا۔ اسے اپنے اوپر اعتماد تھا لیکن کسی نے اس پر اعتماد نہیں کیا۔ ممکن ہے اس نے غلطی ہی کی ہو۔ کٹی کو وہ سکھی بنا سکتا تھا۔ جیون دادا کو اپنے گھر میں خوش آمدید نہیں کہتا تو شاید کٹی اس کے پاس رہتی۔ اس نے کچھ نہیں کیا، وہ کچھ کر نہیں پایا۔ بھیم، دریودھن چھوڑ گئے، گرین، بدرالدین چھوڑ گئے۔ کٹی گئی۔ پتاجی دکھی ہو کر چلے گئے۔ اس نے کون سی غلطی کی ہے؟ اس سے کہاں غلطی رہ گئی؟

اچانک گھر کے پاس آ کر ایک موٹر رکی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں، دیکھنے کی خواہش ہی نہیں ہوئی۔

انوپما موٹر سے اتری۔ پیچھے پیچھے گرین اور نظام۔ نظام کی گود میں نی نی! تینوں باکھر کی طرف دیکھ کر رک گئے۔ کسی کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔

انوپما کی خواہش ہوئی، وہ خوب لوٹ پوٹ کر روئے۔ اسے محسوس ہوا کہ

انمول رتن کا ایک ٹکڑا لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل دھوپ میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے جلے ہوئے مکان کی جانب ایک بار دیکھا۔ اس کے دل میں ہلچل مچ گئی۔ دل ہی دل میں 'پتاجی، پتاجی' کا ورد کرتے جیسے اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ اس طرف نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکی۔

وہ دھیرے دھیرے باکھر کی جانب بڑھی

اتنے لوگوں کی آہٹ نے باکھر کو متوجہ کیا۔

اس نے ایک بار سر اٹھا کر دیکھا۔ انوپما رک نہیں سکی۔ اس کی طرف دوڑ پڑی۔ مٹی کے ایک بڑے تودے سے اسے ٹھوکر لگی۔ وہ ایک دم باکھر کے قدموں میں گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

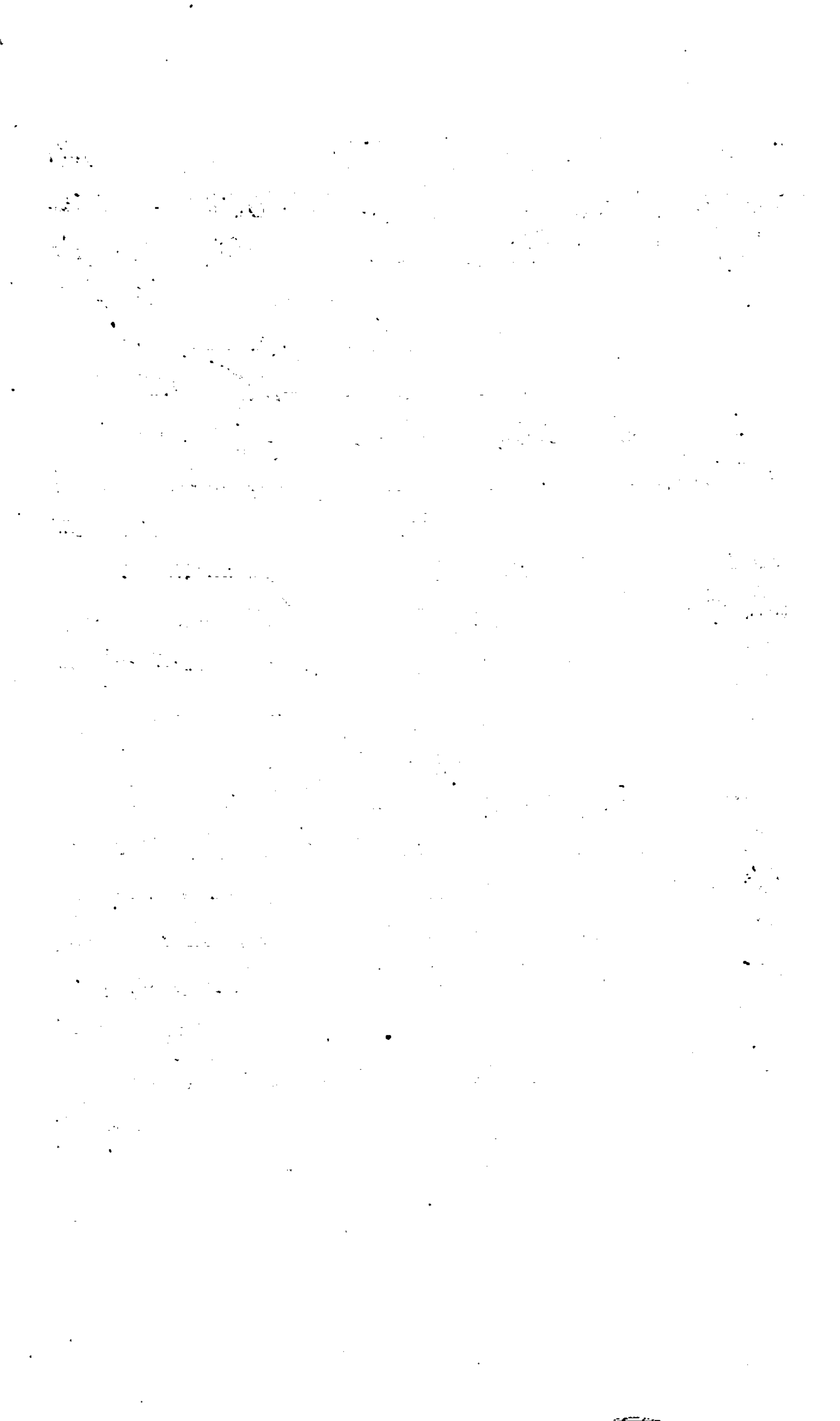
باکھر نے اسے پکڑ کر اٹھایا۔ اس کے کندھے پر سر رکھے انوپما لگاتار روتی رہی۔ آنسوؤں نے اس کے دل کی ساری باتیں کہہ ڈالیں۔ باکھر کی آنکھیں جن کے آنسو خشک سے ہو گئے تھے۔ پھر بھر آئیں۔

اس نے پکارا ——

"کتی، کتی! چھی، رونا نہیں چاہیے۔"

انوپما نے سر اٹھا کر باکھر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ حجامت نہ بنانے کی وجہ سے داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا، اس کی طرف دیکھنے والے اسی کے دیوتا کے دھندلے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی ہے۔ بادل دھیرے دھیرے چھٹتے جا رہے تھے۔ آفتاب کی زندگی بخش کرنیں پھر حرارت بکھیریں گی۔ وہ پھر دھوپ چھاؤں میں بیٹھی زندگی کے حیات افروز گیت گا سکے گی۔ نور کی موجودگی میں تاریکی کا غلبہ اس سرزمین پر ہو نہیں سکتا۔

"ماں" نی نی نظام کی گود سے چیخ اٹھی۔ گرین اور نظام آگے بڑھے آ رہے تھے۔ ڈرائیور موٹر سے اتر کر ان کی جانب حیرت سے دیکھ رہا تھا۔



"بادل چھٹ گئے" آسامی زبان کا وہ ناول ہے جو آسام کے
اس عوامی آندولن کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ جب گذشتہ جنگ عظیم نے
محض ڈُمڈُما شہر کو ہی اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا بلکہ پورے آسام
کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا ——
جنگ کے پسِ منظر میں لکھے گئے ناول میں گوری، نیل کانت،
باکھر، بھیم، نظام، انوپما کے کردار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
شری یوگیش داس آسامی کے حقیقت پسند ناول نگاروں میں
منفرد ہیں اور اپنی فن کاری، چابک دستی اور مقبولیت کے اعتبار
سے ہر نسل میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

قیمت 10-50

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا